ادبی مناظرات

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

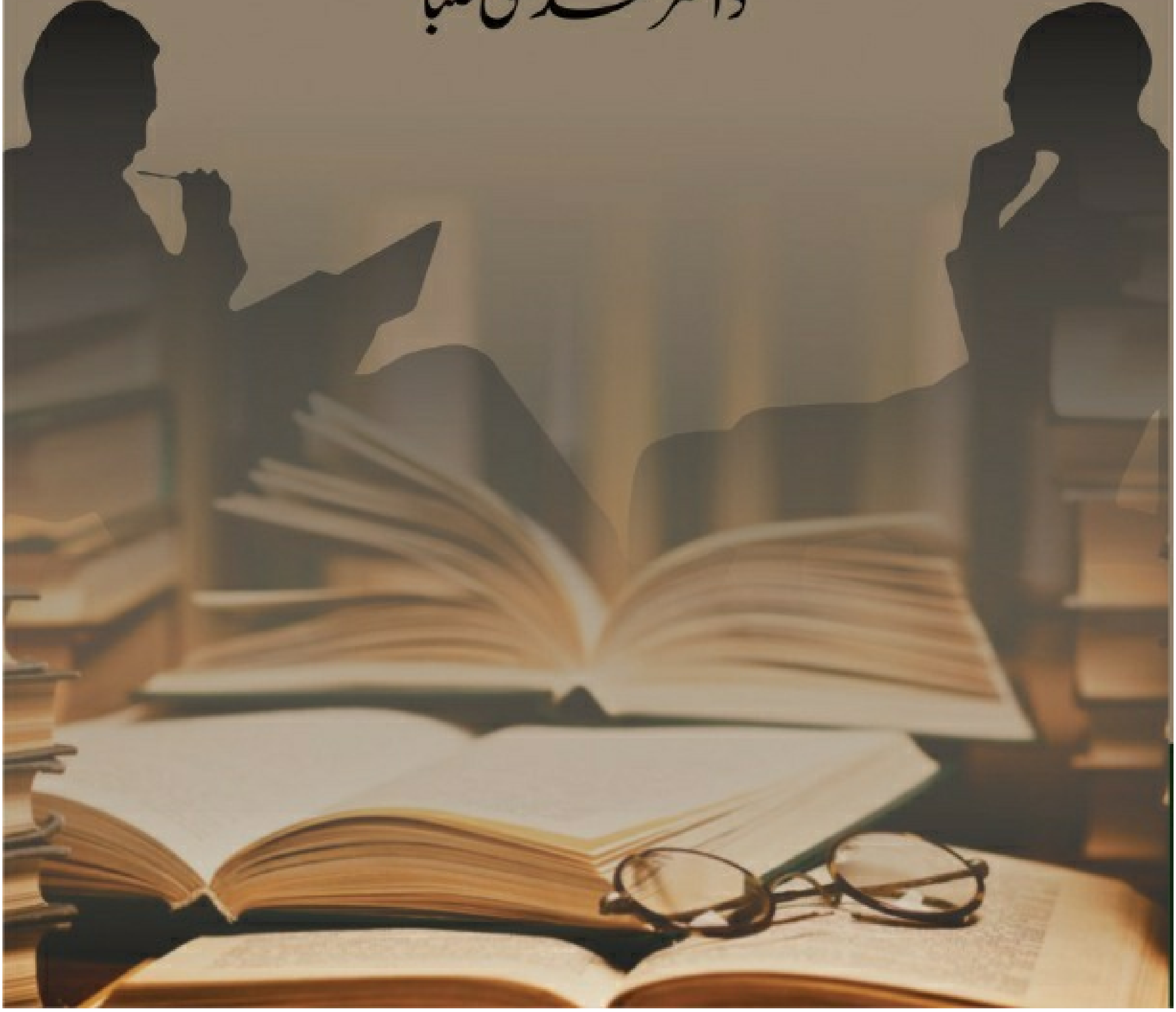

ادبی مناظرات

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

ادبی مناظرات

ڈاکٹر محمد یحییٰ صبا

معاذ پبلیکیشنس
مالیگاؤں (ناسک)- 423203 (انڈیا)

© جملہ حقوق غزالہ شاہین محفوظ

ADABI MUNAZARAT

by :

Dr Md. Yahya Saba

Year of Edition-2015
ISBN:978-81-930477-0-5
Price Rs. 200/-

نام کتاب : ادبی مناظرات
مصنف/ناشر : ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا
سنہ اشاعت : ۲۰۱۹
صفحات : ۱۶۰
قیمت : ۲۰۰
طباعت : معاذ پبلیکیشنس، مالیگاؤں (ناسک)-23203 (انڈیا)

Published By:
MAAZ PUBLICATIONS
H.No.117, S. No.170, Zaitoon Pura,
Malegaon Nasik, Maharashtra, India, 423203

انتساب

راکیش کمار پانڈے

کے نام

جو میرے بڑے بھائی ہیں

وہ ہمیشہ تعلیم و ہندوستانی تہذیب وثقافت کے لیے ترغیب دیتے رہتے ہیں

فہرست

پیش لفظ	7
ڈاکٹر شریف احمد بحیثیت استاد	10
شہزادانجم: احتشام شناسی	17
سردار علی کا مایہ ناز مجلّہ شعر وسخن: ذکر، فکر اور فن کی روشنی میں	20
یوسف خشک	24
اردو اور سنسکرت ہندو پاک کا مشترکہ کلچر اور روح ہے	33
پروفیسر غیاث الدین اور زوال آدم خاکی	40
ارریہ کی تاریخ وتہذیب	48
آوٹرم لین۔ایک نظر میں	56
سردار علی کی ادبی وصحافتی خدمات	59
میراجی دیدہ ور نقادوں کی نظر میں (1912-1949)	68
لوک ادب: ایک تفہیم	102
خانوادۂ کریمیہ سلون	107
فرحتِ روح کا شاعر: اصغر گونڈوی	112
ہندوستانی تہذیب: ایک ساجھی وراثت	130
جنگ آزادی اور اردو	139
کویت میں ادبی پیش رفت: ایک ادبی مکالمہ	151

پیش لفظ

اردو کے قاری کے حیثیت سے میں نے جو کچھ بھی پڑھا اسے بغور پڑھنے کی کوشش کی۔ چاہتا تھا کہ اس میں سے چند نگارشات کو اپنے خالی دامن میں بھرلوں اور پھر اسی سے اپنی شخصیت کی تعمیر کروں لہٰذا اردو زبان وادب کے مطالعے کے دوران یہ احساس بار بار ہوتا ہے کہ اس دشت کی سیاحی کے لیے ایک عمر ناکافی ہے اور میرے خیال میں کئی عمریں ناکافی ہیں۔ قدم قدم پر حیرت زدہ نظارے دامن کو کھینچتے ہیں اور مجھ جیسے طالب علم کو دعوت فکر دیتے ہیں کہ ہنوز دہلی دوراست۔ یہ سچ ہے کہ ابتدائی تعلیم کے دوران کسی بھی طالب علم کی صاف وشفاف تعلیمی خدمت مقرر نہیں ہوتی کہ اسے آگے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ لیکن جیسے جیسے تعلیم کے مدارج کو پار کرتا جاتا ہے تو اسے تعلیم سے دلچسپی بڑھنے لگتی ہے۔ پوسٹ گریجویشن تک آتے آتے کسی حد تک حدف کی نشاندہی ہوجاتی ہے لہٰذا مجھ جیسے لوگ اس وقت سنجیدگی سے ادب کو پڑھنا شروع کرتے ہیں۔ اس میں وہ لوگ مستزاد ہیں جنھیں زبان وادب ورثے میں ملتی ہے۔

میں بھی ایسے ہی ایک قافلے کا طالب علم ہوں اور میں نے زبان وادب کو ایم اے اور اس کے بعد ہی سنجیدگی سے پڑھنا شروع کیا۔ لیکن پتہ نہیں وہ کون سی ایسی بات تھی جس نے مجھے اوائل طالب علمی سے ہی ہر شئے کو غور سے دیکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ اسی تجسس کے جذبے نے مجھے ادب کے کونے کونے میں جھانکنے کا موقع عطا کیا، یہی تجسس کا جذبہ تھا جس کی بدولت میں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا اور دوران تحقیق میں نے دیکھا کہ ”کیسے کیسے ایسے ویسے ہوگئے“۔

مضامین کا یہ انتخاب جو آپ کے زیر مطالعہ ہے ضرورت کہ تحت لکھے گئے مضامین قطعی نہیں یہ سارے مضامین خودرو پودے کی طرح برسوں میرے ذہن میں توجہ کے طلب گار رہے ہیں۔

اور جب وہ صفحہ قرطاس پر آئے ہیں تو بھی میں نے انھیں قابل اعتنا نہیں سمجھا اس کتاب میں شامل مضامین کسی ایک خاص نہج کے پابند نہیں بلکہ مختلف افکار کا نتیجہ ہیں اور ان کے عناوین بھی مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اردو زبان کا دامن جتنا وسیع ہے اس کے تمام گوشوں پر نظر ڈالنے کی صلاحیت ایک طالب علم میں نہیں ہو سکتی، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اپنا فرض مجھے پوری ایمانداری سے ادا کرنا ہے اور مضامین قلم بند کرتے وقت میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔ مجھے قطعی یہ دعویٰ نہیں کہ میرے یہ مضامین اپنے موضوع کو پوری طرح واضح کر سکتے ہیں، لیکن اگر میرے مضامین کے ذریعہ کسی اہم موضوع کی نشاندہی بھی ہو جائے تو میرے لیے یہ باعث تسکین ہوگی۔ کیونکہ یہ سبھی مضامین تاثراتی نقطۂ نظر کے زیر اثر قلم بند کیے گئے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے فرش کی خاک روبی کرتے وقت میں نے خالی ادبی نظریات وعقائد نیز ان سے ابھرنے والے ادبی شہہ پاروں کا وسعت نظری سے مطالعہ کیا ہے اور ان خیالات سے اپنے ذہن و دل کو مالا مال بھی کیا ہے۔ استادان ادب کی صحبت میں بیٹھا ہوں اور ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کے دوران ان کے علمی کمالات سے اپنے دیدہ و دل کو تابناک ہو تے ہوئے محسوس بھی کیا ہے۔ ان مضامین میں اگر آپ کو کسی خوبی کی رمق نظر آئے تو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ کے فیض کا کرشمہ سمجھیں۔ جنھوں نے دوران طالب علمی ہمیشہ میری رہنمائی کی اور میری صلاحتوں کو صیقل کیا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ میرے یہ منتخب مضامین اردو ادب کے بحر لا متناہی میں بلبلے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ آپ کی پذیرائی میرے حوصلے میں اضافہ کر دے اور میں تحقیق کے گہرے کنویں میں ڈول ڈالنے کی جرات کر سکوں متن کے مطالعہ کے دوران اندرون متن موجود میرے جذبے اور معلوم ذرائع پر بھی نظر ڈالنا دیانت داری ہوگی، کیونکہ اس کتاب میں موجود ایسے مضامین بھی ہیں جن کی توسیع کے لیے مجھے چند پیراگراف سے زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوئے یا کسی موضوع میں بالکل بھی کچھ ہاتھ نہیں آسکا۔ میرے قارئین میری اس مجبوری سے یقیناً واقف ہونگے اور ان کی ہمدردیاں مجھے حاصل ہونگی۔ اور اگر آپ نے کچھ حاصل کیا تو یہی میری کامیابی اور محنت

کا صلہ ہوگا۔اس بات کا اعتراف کرتا چلوں کہ یہ خاکسار چونکہ تاریخ کا بھی طالب علم رہا ہے اس لیے مضامین میں تاریخی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے چند مضامین اس نہج کے بھی ہیں۔دعا اور مشورے کا طالب ہوں۔

ڈاکٹر محمد یحیٰ صبا

ڈاکٹر شریف احمد بحیثیت استاد

ڈاکٹر شریف احمد کا شمار اردو کے ان اساتذہ میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو شعر وادب کو اپنی تدریس کے دوران انگریزی اور دوسری زبانوں کے ادبیات کے فنی محاسن سے تقابل بھی کیا اور اردو کی اہمیت پر زور بھی دیا۔ تدریسی مصروفیات کی وجہ سے ڈاکٹر شریف احمد کی چند کتابیں ہی منظر عام پر آسکیں ، جن میں ''عبدالحلیم شرر شخصیت اور فن'' کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ غالب کے سلسلے میں کہا جاتا ہے کہ اگر ان کو کل ادبی سرمائے سے محروم کر دیا جائے اور صرف ان کی اردو کلیات ہی رکھا جائے تو ان کی اہمیت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ یہی قول ڈاکٹر شریف احمد کی کتاب پر صادق آتا ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد کے سلسلے میں یہ بات پوری دیانت داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اسم بامسمی تھے۔ ڈاکٹر شریف احمد یکم اپریل 1930 کو امروہہ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم اپنے آبائی وطن میں ہی حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ممبئی منتقل ہوگئے۔ انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کے امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1950 میں کرناٹک کالج دھاروارڈ میں اردو اور فارسی کے اسسٹنٹ لیکچرر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد تقریباً ایک سال الفنسٹن کالج ممبئی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں 1958 میں شعبہ اردو یونیورسٹی آف جموں اینڈ کشمیر سری نگر میں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر شریف صاحب کی ہمیشہ خواہش رہی کہ وہ دہلی یونیورسٹی میں بحیثیت استاد اپنی خدمات پیش کریں۔ چنانچہ جنوری 1962 میں دہلی یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف پوسٹ گریجویٹ اسٹیڈیز (ایوننگ کلاسیز) میں شعبہ اردو کے استاد مقرر ہوئے اور 1995 تک اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے دیتے رہے۔

دوران تذکرہ اور ڈاکٹر فیروز دہلی کے مضمون (شائع کردہ ایوان اردو دہلی ستمبر 2012) سے پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کو موسیقی سے کافی شغف تھا۔ اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی ممبئی میں منعقد ہونے والے متعدد پروگراموں میں حصہ لیتے تھے۔ 1953 میں کاؤس جی جیانگر ہال (ممبئی) میں ہندوستانی موسیقی کے سالانہ میلے میں ایکسپرٹ کے ساتھ اپنی غزل سرائی کا مظاہرہ بھی کیا۔ اس بات کا انکشاف ڈاکٹر مظہر نے شعبہ اردو کے تعزیتی جلسے میں کی تھی کہ کلاسیکی موسیقی کا اتنا لگاؤ تھا کہ جب ہم لوگ ان کے گھر کبھی جاتے تو دیکھتے کہ گھنٹوں وہ موسیقی کے کیسٹ سن رہے ہیں۔

ڈاکٹر شریف استاد تو اردو کے تھے مگر ان کی دلچسپیاں دیگر میدانوں میں بھی تھیں اس میں ایک میدان تھیٹر کا بھی ہے۔ وہ 1952 سے 1954 تک انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن کے ممبر بھی رہے۔ اس کے علاوہ 1969 میں غالب صدی کے موقع پر دہلی یونیورسٹی میں غالب پر اسٹیج کیے گئے ایک ڈرامے میں انہوں نے بطور اداکار کام بھی کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ان کی کوئی چند تصانیف ہی منظر عام پر آسکی تھیں۔ انہوں نے تحقیقی مقالہ عبدالحلیم شرر شخصیت وفن کے علاوہ متعدد تنقیدی مضامین قلم بند کیے جو کہ 1977 میں ''مشاہدے'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کی ایک اہم کتاب عالمی تہذیب وتمدن سے متعلق ''تہذیب کی منزلیں'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک پہلو ان کے مترجم کی ہے۔ انہوں نے جتیندر کمار کے ناولٹ ''تیاگ پتری کا اردو میں ترجمہ ''استعفیٰ'' کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ پہلے رسالہ ''شاہراہ'' دہلی کے ناولٹ نمبر میں شائع ہوا بعد میں ممبئی میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد 1955 امریکی ناول نگار ہمینگوے کا معروف ناول '' Old man and she sea'' کا ترجمہ ''ساحل اور سمندر'' کے نام سے کیا۔ ''عبدالحلیم شرر شخصیت وفن'' سے متعلق ڈاکٹر فیروز دہلوی لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کے مقالے کی تکمیل کے بعد کئی لوگ اس موضوع کی طرف متوجہ ہوئے اور ڈاکٹر صاحب کے تحقیقی مطالعے سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس چراغ سے اپنے چراغ روشن کیے۔ دوران تدرس سری نگر کشمیر کے دوماہی رسالہ ''نیا

شعور‘‘ مرتب کیا۔ دہلی یونیورسٹی کے ایوننگ انسٹی ٹیوٹ کے رسالے Eventaile کے آٹھ سال ایڈیٹر رہے۔ اس کے علاوہ کتابوں پر تبصرہ سے متعلق رسالہ ’’ادبی تبصرے‘‘ ڈاکٹر صاحب کے چند اشخاص کے ساتھ مل کر شائع کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے تصنیفی میدان کا ایک اہم کام متعدد کتابوں پر پیش لفظ کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیائی تقریریں اور تبصرے ہیں۔ وہ متعدد اداروں کے رکن بھی رہے جن میں اردو اکادمی دہلی خاص طور سے شامل ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد کی عبدالحلیم شرر پر ادبی کاوش کی اہمیت یوں بھی ہے کہ محققین نے عبدالحلیم شرر پر بہت کم توجہ دیا۔ ان کی بیش بہا نگارشات کی قدر و منزلت کو جس طرح منظر عام پر لانا چاہیے اس پائے کا کام نہیں ہو سکا تھا۔ ڈاکٹر شریف احمد نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ان کی تمام نگارشات کو کماحقہ چھان پھٹک کر کے ایک ایسی کتاب تصنیف کی جس سے عبدالحلیم شرر کی زندگی اور ان کے تمام فنی گوشے منظر عام پر آسکے۔

اس کے مطالعے سے یہ بات ہم پر عیاں ہوتی ہے کہ آٹھ ابواب پر اس کو تقسیم کیا گیا ہے جس میں پہلے باب میں مصنف کے زمانی، سیاسی و سماجی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ باب دوم میں حیات و شخصیت کے تمام ضروری اور نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب سوم کے تحت ان کی تصانیف کو فہرست اور اعتبار سے نقل کیے گئے ہیں۔ چوتھے باب میں ناول پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں شرر کے نشانیوں سے متعارف کرایا گیا ہے۔ چھٹا باب تاریخ و سوانح کے عنوان سے لکھا گیا ہے جبکہ ساتویں باب میں شاعری، تراجم اور ان کی دوسری فنی سرمایہ پر گفتگو کیا گیا ہے۔ آٹھویں اور آخری باب اسلوب و اثرات کے عنوان سے ہے جو کہ کسی بھی ادبی کاوش کا اہم حصہ ہے۔ اس باب کے تحت شرر کے کردار کو اردو شعر و ادب میں نمایاں کیا گیا ہے اور ان کے منفرد انداز و اسلوب کو اردو کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے اور اس کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر شریف احمد کی یہ تصنیف معلومات کا ایسا ذخیرہ ہے کہ اس کے مطالعے سے ایک دور کے ادبی رنگ و آہنگ کا بخوبی اندازہ لگانے کے ساتھ اردو ادب و فکشن سے دلچسپی پیدا ہو جاتی

ہے کسی بھی تحریر کا یہ کمال ہے کہ قارئین کے اندر مطالعے کا شوق و جذبہ پیدا کر دے اور یہی کام اپنی تصنیف کے ذریعے ڈاکٹر شریف احمد کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو آزاد طبع نے تنقید و تحقیق کے تمام اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے ایک ادبی نقطۂ نظر سے اپنا ایک انداز و اسلوب قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کی یہ تصنیف اساتذہ اور تحقیق کے طالب علموں کے لیے ایک مقامی نو منہ ثابت ہو سکتی ہے اس کتاب کی تیاری میں جو بھی کمیاں اور نقص رہ گئی ہے اس کا اعتراف اس کتاب کے دیباچہ میں مصنف نے کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر شریف کی تمام تر صلاحتیں درس و تدریس کی نذر ہو گئیں اور تصنیف و تالیف کے میدان میں کوئی بڑا ذخیرہ چھوڑ کر نہیں گئے صرف چند کتابیں اور چند مضامین ہی ان کی ادبی و فنی مثبت مسلم کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک استاد نے اپنے فرائض انجام دیے اور اس میں ان کے ریسرچ اسکالر اور ان کے ساتھیوں کے آراء سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً:

ہم ہندستانیوں نے بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر غالب کو ہندوستان میں اردو کی قومی شاعر کا خطاب عطا کیا اور بعد موصوف کے ارتحال کے ان کی شخصیت کو خوب سراہا۔ زمانہ قدیم سے ہم سب اس قدیم اور کہنہ روایت کی پاسداری کرتے آ رہے ہیں اور کسی بھی بڑے ادیب و شاعر کو ان کی موت کے بعد ہی ان کی قدروں کو سراہتے ہیں جو ادبی کفر نہیں تو تسامح ضرور ہے۔

شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر استاد ڈاکٹر شریف احمد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے انتقال پر پورے عالم میں نشستیں ہوئیں۔ شعبہ اردو کروڑی مل کالج میں مجھ سے بھی نہیں رہا گیا لہٰذا میں نے بھی اپنے قیام گاہ پر تعزیتی جلسے کا انعقاد۔ جس میں شرکاء نے ان کے علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور ان کی مغفرت کے لیے دعا کی۔ اس تعزیتی جلسہ میں میں نے پروفیسر شریف احمد کی درس و تدریس کو ماضی کے جھروکوں کی روشنی میں مغفور کی تعلیمی اور دانشورانہ صلاحیتوں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے ایک سبق کا ذکر کر کے پروفیسر شریف احمد کی تحریروں کے بارے میں کہا۔ ''میری تحریریں ہمیشہ عدل، انصاف، صداقت کا مرقع، انسان دوستی، قومی یکجہتی، اخوت مروت، شجاعت، بھائی چارگی اور سیکولرزم پر مبنی ہوتی ہیں۔ میں نے اسی لیے اپنی یہ تحریریں

آپ کی خدمت میں پیش کی ہیں اگر اس تحریر نے آپ کا جذبہ اندرون پیدا کر دیا اور اگر ایک شاندار مستقبل کے لیے آپ کی امنگوں نے نئی کروٹ لی تو میں سمجھوں گا کہ میرے قلم نے جسے میں قوم کی مقدس امانت سمجھتا ہوں اپنی حرمت باقی رکھی اور اپنا فرض ادا کر دیا'۔'' پروفیسر شریف احمد بچوں کی تعلیم وتربیت اور اساتذہ کی ذمہ داریوں کے بارے میں بخوبی واقف تھے'۔انسانی دماغ کے لیے جہاں صیقل کا کام تعلیم کرتی ہے، وہیں کسی معاشرے کے لیے ایک راہ متعین کرتی ہے۔ فطرت نے انسانی دماغ کی تشکیل کچھ اس طرح کی ہے کہ ابتدا سے ہی بچہ اپنے آس پاس اور اپنے بڑوں سے سیکھتا ہے۔ ماہرین تعلیم میں ایک پرانی بحث ہے اور اس کا فیصلہ آج تک نہیں ہوسکا کہ آیا بچہ اپنی زندگی کی راہ اپنی وارثت میں لے کر دنیا میں آتا ہے یا ماحول کے اثرات سے یہ راہ متعین ہوتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہر بچہ فطری نظام کی مشین کا ایک پرزہ ہے اور کارساز فطرت خود جانتا ہے کہ کون سا پرزہ کس جگہ فٹ ہوگا بچپن کے نامساعد حالات اور غلط ماحول کے اثرات کے باوجود کچھ کو جو کچھ ہونا ہوتا ہے بن جاتا ہے۔تاہم ماحول کے اثرات اور تعلیمی تاثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاتا ہے۔تاہم ماحول کے اثرات اور تعلیمی تاثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کسی قوم کے لیے ایک لائحہ عمل ایک مخصوص قسم کی تعلیم سے ہی بن سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ علمی سرگرمیاں ہر دور میں انسان کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے۔لیکن علمی سرمایہ کسی ایک ملک یا کسی ایک قوم کے پاس مقید نہیں رہا۔ بلکہ بڑھتا رہا پھیلتا رہا۔کبھی ایک قوم نے سرپرستی کی کبھی دوسری قوم نے۔

تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ جس قوم نے علوم وفنون کی قدر دانی کی اوران سے صحیح معنوں میں استفادہ کیا وہ امامت کے منصب پر فائز رہیں۔اور جن قوموں نے انہیں نظر انداز کیا یا ان سے غلط استفادہ کیا وہ اپنے بلند مقام کو بہت جلد کھو بیٹھیں اور انہیں دوسروں کا مطیع بن کر رہنا پڑا۔مصر کی تہذیبی، چین کا تمدن، یونانان کی شائستگی، روما کی عظمت ان سب نے اپنے دور میں علم کی سرپرستی کی اور بام عروج پر پہنچیں اور جب وہ قومیں عیش وعشرت اور رقص وسرور کی محفلوں میں کھو کر علمی کاوشوں سے دور ہوگئیں تو ان کی امامت اوران کی بلندی قصہء پارینہ بن کر رہ گئی۔امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔ جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقے

یا گروہوں سے آگے بڑھ جائے گا۔ وہ اسی طرح ان سب کا امام بنے گا جس طرح انسان من حیثیت النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے۔

پروفیسر شریف احمد جیسے اساتذہ کو زمانہ ہمیشہ اپنے دلوں میں زندہ رکھے گا۔جنہوں نے اس نکتے کا پاس رکھا۔ انہوں نے اپنے تعلیمی و تربیتی کاوشوں سے ایک پوری نسل کی آبیاری کی ہے۔ موصوف کی چند تصنیفات ہی منظر عام پر آسکی ہیں۔لیکن ایک مدرس کی حیثیت سے وہ کامیاب اور مفید ثابت ہوئے۔ میرے موصوف سے دیرینہ تعلق تھے۔استاد اپنے اور دوسرے شعبہ کے طلبا کے ساتھ یکساں طور پر پیش آتے تھے وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر کامیابی حاصل کرنی ہوتو دو زبانوں پر کمال حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہ خود انگریزی ادب میں مہارت رکھتے تھے جس کی وجہ سے انگریزی زبان کے ذریعہ اردو کو بہت فائدہ پہنچایا۔اس دوران ایک خطیب واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ شعبہ کے اساتذہ اور طلبا کی موجودگی میں اس وقت کے صدر شعبہ نے انگریزی میں لکھا ہوا ایک رقعہ اصلاح کے لیے استاد محترم کو دیا۔استاد محترم نے ایک بار دیکھا اور واپس کرتے ہوئے بولے کہ میں سمجھ گیا، جو آپ لکھنا چاہتے ہیں میں اسے کل لکھ کر آپ کے حوالے کردوں گا۔ اس طرح وہ بہت ہی زندہ دل انسان بھی تھے۔شریف احمد کی موت ادب کے لیے تو نقصاندہ ہے ہی،لیکن وہ محفلوں کے لیے زیادہ نقصاندہ ثابت ہوئی کیونکہ وہ محفلوں کے جان تھے۔ پروفیسر شریف احمد ایک باہمت بلند حوصلہ اور زندہ دل انسان تھے۔ انسانی اقدار کی عظمت جو ان کی خیال میں تھی وہ بے حد اہم تھی۔ ان کے ادبی کارنامے کا تعین آنے والا وقت کرے گا۔لیکن ان کی درس وتدریس انتہائی احترام کے ساتھ یاد کی جائے گی۔ وہ باصلاحیت انسان تھے زبان وبیان پر انہیں دسترست حاصل تھا۔ وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے وہ جس محفل میں ہوتے تھے اسے زعفران زار بنا دیا کرتے تھے۔ وہ ایک عمدہ استاد اور بہترین ادیب ودانشور کے علاوہ اچھے انسان بھی تھے۔ نئے اور باصلاحیت لوگوں کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے پارکھ انسان تھے۔ طالب علموں کی صلاحیت کے معیار کے مطابق درس وتدریس دیا کرتے تھے ان کی رحلت ایک ایسا سانحۂ ہے جو اردو ادب میں بحیثیت استاد جلدی نہیں بھرا

جاسکتا۔شریف احمد کے درس کا عالم میں نے دیکھا ہے کہ جب وہ کسی سمینار میں خطبہ دیا کرتے تھےتو ان کے ہمعصر ہی نہیں بلکہ ان کے وقت کے اکابرین ان کی طرف متوجہ ہوجایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر شریف احمد کی علمیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ریاض احمد نے فون پر ان کی علمیت کا ذکر کیا اور کہا کہ جب وہ درس کے دوران بول رہے ہوتے تو ایسا لگتا کہ علم کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہو اور گھنٹوں گزرنے کے بعد بھی وہ تازگی اور تشنگی باقی رہتی۔خدا ان کی مغفرت کرے اور جنت میں ہم ان کے درجات کی بلندی کی دعا کرتے ہیں۔ساتھ ہی میں شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ اور پروفیسر شریف احمد کے طلبا جو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں سے درخواست کرتا ہوں کہ موصوف کا جو بھی غیر مطبوعہ سرمایہ ہے ان کو تلاش کریں اور کتابی شکل میں منظر عام پر لائیں،تا کہ اردو زبان وادب کے قارئین اور طلبا کو موصوف کے ادبی کارنامے سے فائدہ ہو۔

شہزاد انجم: احتشام شناسی

احتشام حسین کی تنقید نگاری پر بے شمار مضامین و مقالات لکھے اور پڑھے جا چکے ہیں اور کئی مستقل تصانیف بھی منظر عام پر آ کر مقبول ہو چکی ہے لیکن احتشام حسین کی تخلیقی نگارشات پر صرف چند کتابیں ہی شائع ہوئی ہیں۔ سن ۲۰۰۰ میں شائع ہونے والی پروفیسر شہزاد انجم کی کتاب ''احتشام حسین کی تخلیقی نگارشات'' جب شائع ہوئی تو اس وقت احتشام حسین کی تخلیقی شہ پاروں کو کما حقہ نہ تو تلاش کیا گیا تھا اور نہ ہی اس پر کوئی مستقل کتاب موجود تھی۔ اس اہم اور اچھوتے موضوع پر پروفیسر شہزاد انجم کی یہ کتاب احتشام حسین تنقید میں اہم اضافہ ہے۔ یوں تو پروفیسر شہزاد انجم کی متعدد تصانیف اور بے شمار مضامین معتبر ملکی اور بین الاقوامی ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو کر ارباب نظر سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، لیکن احتشام حسین کی تخلیقی جوہر پر کام کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ احتشام حسین کے اندر تنقیدی شعور کے ساتھ ساتھ بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں موجود تھیں۔ چونکہ اس کتاب سے قبل احتشام حسین کے تنقیدی پہلو پر ہی کام کیا گیا تھا۔ اس لیے یہ موضوع نیا اور اہم بھی ہے۔

ڈاکٹر احتشام حسین نے اپنی ادبی تخلیقات منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہی نہیں کیا۔ جیسا کہ بعض نقاد کرتے ہیں بلکہ ان کی ادبی تخلیقات شاہکار کا اہم نمونہ ہے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے ان کا تنقیدی جائزہ لیا اور ان کی قدر و قیمت جدید ادبی منظر نامہ کے تحت متعین کی۔ مصنف نے اپنی کتاب میں احتشام حسین کی شخصیت کے بعد ان کے افسانہ نگاری، غزل گوئی، نظم نگاری، سفرنامے اور مکتوب نگاری تمام اصناف نظم و نثر میں پیش کی گئی تخلیقات کا محکمہ کیا ہے۔ اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے کتاب کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اول شخصیت، دوم افسانہ نگاری، سوم، شاعری، چہارم

سفرنامے اور پنجم مکتوب۔شہزاد انجم کی تخلیق کی خاصیت یہ ہے کہ انہوں نے دوسرے نقادوں کے آرا کی حوالے سے اپنی بات کو مدلل اور منطقی نقطہ نظر سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

احتشام حسین کی شعری خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے ان کے غم ذات اور غم کائنات کو سمونے کے فن کو واضح کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے احتشام حسین کی تمام تخلیقات کی تلاش جستجو کی ہے۔شعری محاسن کی جتنی بھی شرطیں ہوسکتی ہیں مصنف تخلیق کار کی شاعری میں موجود ہونے کا دعویٰ پیش کرتے ہیں اور اس کو دلیلوں سے واضح بھی کرتے ہیں۔

'ساحل اور سمندر' اور 'سوویت یونین تاثرات اور تجزیہ' کے اہم سفرنامے ہیں۔ شہزاد انجم نے انہیں تحلیل و تجزیہ کا موضوع بنایا ہے۔خطوط نگاری کے بعد میں دیگر قدیم اور جدید مکتوب نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے احتشام حسین کی اہمیت مکتوب نگاری کے میدان میں ثابت کی ہے۔اس کے علاوہ خطوب نگاری کے مطالعہ سے اس عہد کی تحریکات سیاسی اور تہذیب رجحانات کو واضح کرتے ہوئے اس کی تاریخی اور ادبی اہمیت ثابت کرتے ہیں۔اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین کو احتشام حسین کے وہ پہلو جو تنقید کے علاوہ تخلیقی ہیں اور جن سے اردو دنیا ایک دہائی قبل بے خبر تھی باخبر کرتے ہیں۔مصنف کی خاصیت یہ ہے کہ جو بھی بات کہتے ہیں وہ مدلل اور منطقی اصولوں پر مبنی ہوتا ہے۔شہزاد انجم کی اس کتاب کو بذات خود تخلیق کا ایک اعلیٰ نمونہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ تنقیدی پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے تخلیقی عنصر ماند پڑ جاتا ہے لیکن مصنف کے قلم کی داد دینی پڑے گی کہ انہوں نے احتشام حسین کی ادبی تخلیقات کو جنہیں انہوں نے خود بے رنگ سمجھا تھا آج شہزاد انجم کی اس کتاب کی بدولت انہیں ایک تخلیق کار کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ برصغیر کے مایہ ناز تنقید نگار اور دانشور پروفیسر شارب ردولوی کی رائے کے مطابق شہزاد انجم کے نظریات بدلتے ہوئے حالات میں بھی ادب کی تفہیم اور ادبی اقدار کے تعین میں رہنمائی کرتے ہیں۔کتاب کی پشت پر لکھے گئے شارب ردولوی کی نوٹ میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ 'شہزاد انجم ایک ادب کے سنجیدہ قاری ہیں'۔ان کی یہ ادبی کاوش ان کے علمی ذوق،خلوص،محبت اور تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کا یہ ادبی سفر جاری رہے گا اور ان کی تحریریں قدر

کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔کتاب کے مطالعہ کے بعد اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ شارب ردولوی جیسے جید تنقید نگار کی رائے حرف بہ حرف صحیح ہے۔شہزاد انجم سرورق کے فلپ پر احتشام حسین کی خطوط نگاری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر احتشام حسین صرف تنقیدی اور تحقیقی مقالات ہی لکھتے اور خطوط نگاری پر توجہ نہ دیتے تو ان کے تنقید میں وہ جوہر پیدا نہ ہوتا جو آج ہے نیز ان کے سفرناموں کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ احتشام حسین کے سفرناموں سے ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ فکر ونظر کی تعمیر میں ان کے سفر امریکہ اور یوروپ نیز روس نے کس قدر مدد پہنچائی۔ان کے افسانوں کے ذریعہ ہم ان کی ہمدردی اور ان کے کرب دونوں کا احساس کرسکتے ہیں۔احتشام حسین کی شاعری محسوسات کی دنیا کو سمیٹتی ہے۔ان سب باتوں سے گویا مصنف یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر احتشام حسین ایک اچھے تخلیق کار نہ ہوتے تو ایک اچھے تنقید نگار نہ بنتے۔

اچھی تخلیق کی خاصیت یہ ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے حالانکہ بعض جید عالموں نے مذکورہ کتاب پر تذکرہ وتبصرہ کیا ہے لیکن میری نظر سب سے پہلے احتشام حسین پر لکھی گئی شہزاد انجم کی کتاب پڑی۔جس کو مصنف نے ۱۳/اپریل ۲۰۰۰ کو عنایت کی تھی۔جس سے میں بارہاں مستفید ہوتا رہا ہوں اور اپنے آپ کو ریفریش کرتا رہا ہوں۔میں سمجھتا ہوں کہ موصوف کے اس ادبی کاوش کو ہندوستان کے مختلف جامعات کے اردو نصاب میں شامل ہونا چاہیے تاکہ اہل علم حضرات اس کتاب کے مطالعہ سے اپنی استعداد میں اضافہ کرسکیں۔

سردار علی کا مایہ ناز مجلّہ شعر و سخن: ذکر، فکر اور فن کی روشنی میں

عالمی منظر نامے پر اردو شعر و ادب کے تعلق سے جن جیالے قلمکاروں اور اردو کے خدمتگاروں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سردار علی کا نام بھی نمایاں ہے۔ سردار علی کے کل ادبی سرمائے کو نظر انداز کر دیا جائے اور کنیڈا سے شائع ہونے والا ان کا ادبی رسالہ سہ ماہی ''شعر و سخن'' پر گفتگو کی جائے تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اور زندگی کے جھمیلوں اور مصروفیات کے باوجود خدمت خلق کا اس طرح بے پناہ خدمت خلق جذبہ کسی کی بھی مغفرت کے لیے کافی ہے۔ سہ ماہی شعر و سخن کا غائر مطالعہ کیا جائے تو اسے ایک تحریک کا نام دے سکتے ہیں۔ رسالے کے ہوم پیج پر نظر پڑتے ہی خوش آمدید، عید مبارک یا تہنیت کا کوئی نہ کوئی جملہ ضرور مل جائے گا اور ٹھیک اسی کے پیچھے چند اشعار جو کہ مدیر کے حوصلے، اس کے منشا اور ارادے کی دلیل پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ اس رسالے کے مواد سے استفادہ کے لیے بائیں طرف درج فہرست میں سب سے پہلے حمد و نعت ہے اس کو کلک کرتے ہی مختلف شعراء کے حمدیہ اور نعتیہ کلام سے ہم مستفید ہو سکتے ہیں۔ دوسرا حصہ اسلامیات ہے اس کے تحت رمضان المبارک، حج و زکوٰۃ، اسلامی عقائد و احکامات پر مضامین موجود ہوتے ہیں ادب سے قریب اور عقیدہ کا جو رشتہ ہے اس کو مدیر نے یہاں مستحکم کر دیا ہے کہ آپ کو کسی مدرسہ و خانقاہ کے بجائے اپنے انٹرنیٹ پر ہی سب کچھ مواد دستیاب ہیں۔ ادبی تقریبات کے تحت مختلف خطے اور علاقوں میں واضح اداروں اور یونیورسٹیوں اور کالجوں میں منعقد ہونے والی حالیہ ادبی تقریبات پر خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اس کالم سے پوری دنیا میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں کا پتہ بیٹھے بیٹھائے لگایا جا سکتا ہے۔

اس رسالے کا سب اہم حصہ مضامین کا ہے اس کے تحت شائع ہونے والے ادبی،

تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا وہ اہم سرمایہ ہوتا ہے جس سے اردو ادب کی آبیاری اور اس کی سمت ورفتار متعین ہوتی ہے۔ ''افسانے'' ایک ایسا گوشہ ہے جس کے تحت افسانوی تخلیقات کو شائع کیا جا تا ہے کہنہ مشق افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ جواں سال افسانہ نگاروں کی تحریروں کو خوش اسلوبی سے جگہ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد ''شاعری'' پر کلک کرتے ہی مختلف شعراء کے تازہ کلام سے غزلوں اور نظموں کے علاوہ دوسرے اصناف وسخن کے نمونے شائع کیے جاتے ہیں۔ ایک اہم بات جو اس رسالے کی قدر ومنزلت میں اضافہ کرتی ہے وہ یہ کہ اس جگہ کو کافی فراوانی ہے جس سے مدیر زیادہ سے زیادہ شعراء وادباء کو ایک ہی ویب سائٹ پر شائع کر سکتا ہے۔ ایک دوسری خوبی یہ کہ گزشتہ شمارے بھی اس کالم میں نیچے دیئے ہوتے ہیں جس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ''طنز ومزاح'' کے عنوان سے ایک اور تخلیقی کالم ہے جس میں مزاحیہ مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ ''برقی کتب'' پر کلک کرتے ہی ''سب رس'' حیدرآباد سے شائع ہونے مجلّے کے علاوہ مختلف شعراء وادباء کی تخلیقات ناول، افسانوی مجموعے تنقید وتحقیق وغیرہ شائع کیے جاتے ہیں جس سے براہ راست ہم لائبریری کی طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔ ''شخصیات'' اس کالم کی ایک اہم وجہ اس لیے ہے کہ اس میں مختلف شعراء وادباء پر مضامین اور انٹرویو شائع کیے جاتے ہیں۔ خاکے پیش کیے جاتے ہیں۔ ''چلتے چلتے'' یہ سردار علی کا نیا اور اہم گوشہ ہے اس میں مختصر سفرناموں کو جگہ دی جاتی ہے سفرنامے شائع کرنے کی روایت چونکہ قدیم نہیں ہے اس لیے یہ ایک خوش آئند قدم ہے جس میں ادباء اور شعراء کے ادبی افکار کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس ویب سائٹ کو دیکھنے سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ صرف ادبی رسالہ ہی نہیں ہے بلکہ دلچسپی کے لیے مختلف ادبی پہلوؤں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں فلمی وغیر فلمی ویڈیو کلپنگ بھی موجود ہے۔ جو کہ اکثر مزاحیہ یا ادبی ہوتے ہیں۔ جس کے ذریعہ مدیر نے اپنے رسالے میں قاری کے ذوق اور مختلف طبقے اور مکتب فکر کے قارئین کے لیے ضروری اور اہم مواد جمع کر دیا ہے۔ ''اس ماہ کا نغمہ'' اس کے عنوان سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے موجودہ شمارہ میں پسندیدہ چند نغمے اپلوڈ کیے گئے ہیں جس سے قاری کے ادبی ذوق کے ساتھ ساتھ ذہنی اور جذباتی ذوق کی بھی آبیاری ہوتی رہے۔ ''کلام بزبان شاعر'' آپ

نے یقیناً اس جیسا پروگرام ٹی وی دیکھا یا ریڈیو پر سنا ہوگا جس میں شاعر خود اپنی زبان اور اپنے لہجے میں اپنے کسی کلام، غزل یا نظم کو پیش کرتا ہے۔ کسی بھی شاعر کے کلام کو خود اس کی زبان سے سننے سے اس کی معنویت واہمیت دوگنی ہو جاتی ہے کیونکہ نغمے کے ساتھ شاعر کے دلی جذبات شامل ہوتے ہیں وہ اس کی وجہ تخلیق بھی بتلاتا ہے۔ یہ ایک اہم گوشہ ہے کہ جس کو مدیر کی فکری پرواز نے شامل ہونے کا موقع دیا۔ مندرجہ بالا گوشے شعری کلام سے متعلق ہیں اس کے بعد ''آواز کی دنیا'' میں ادیبوں، قلمکاروں اور دانشوروں کی تقاریر ان کے نغمے بالخصوص کوئی اہم کلاسیکی نغمہ یا کوئی ادبی مباحثہ پیش کیا جاتا ہے۔

''ادب نامہ'' بھی ''ادبی تقریبات'' کے طرز کا گوشہ ہے اس میں مختلف تعلیمی اور تحقیقی اداروں کے جلسوں اور میٹنگوں کی روداد اور فوری طور پر رونما ہونے والی کسی ادبی سرگرمی پر مباحثہ یا پریس ریلیز سے متعلق ہوتا ہے۔ اس کالم کا فائدہ یہ ہے کہ قاری براہ راست دنیا کے کسی بھی خطے میں منعقد ہونے والے ادبی پروگرام کی خبروں سے واقف رہتا ہے۔ ''اردو ٹیچر'' یہ رسالے کی ایک ایسی خدمت ہے جس کو کبھی فراموش نہیں کیا سکتا ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے کسی الگ ویب سائٹ کی ضرورت درکار تھی لیکن مدیر نے ان تمام سہولیات کا جو کہ اردو سے متعلق ہیں وہ یکجا کر دی ہیں۔ اس حصے میں اردو سیکھنے اور سیکھانے کے طریقہ کار کمپیوٹر کے ذریعے ہی بتلائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سبق آمیز قصوں، لہجے اور انداز گفتگو سیکھنے کے لیے مختلف کلپنگ اپلوڈ کی گئی ہیں، اس حصے سے اردو سیکھنے والے غیر اردو داں طبقے کو بہت زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔ سردار علی کی یہ کوشش اور سمجھ اردو کی اتنی بڑی خدمت انجام دے رہی ہے اس کا اندازہ رسالے کے مطالعے سے بحسن وخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ''دیگر ویب سائٹ'' کے تحت اردو سے متعلق پوری دنیا میں اہم ویب سائٹ کے پتے موجود ہیں جس سے نہ صرف سہ ماہی شعر وسخن بلکہ آپ کے کسی بھی اردو کے اہم ویب سائٹ کو اسی وقت وزٹ کر سکتے ہیں۔ یہ بہت بڑی اردو کی خدمت ہے جس کو صرف نیک نیتی سے انجام دیا گیا ہے۔ آخر کے گوشے میں مختلف حضرات اور قارئین کے آرا کو خطوط کے کالم میں شائع کیا جاتا ہے۔ جس میں مفید مشوروں کے علاوہ ضروری معلومات بھی شائع

ہوتی ہیں اس کے علاوہ ویب سائٹ پر یادگار تصاویر بھی موجود ہیں۔ سردار علی نے جس منظّم انداز میں اس رسالے کو شائع کیا ہے اور کرتے آئے ہیں ان کی خدمت کو کبھی اردو دنیا فراموش نہیں کرے گی۔ ہوم پیج پر بھی بہت ساری ضروری معلومات سامنے ہی جمع کر دی گئی ہیں۔ جس میں اردو ٹیچر اور آرکائیو کا کالم بھی موجود ہے۔ اس رسالے کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ پرانا ذخیرہ اس میں ہٹایا نہیں جاتا ہے بلکہ وہ آرکائیو میں موجود رہتا ہے۔ مدیر کے ذوق سلیم کی داد اس لیے بھی دینی پڑے گی کہ انہوں نے اس کی حسن کاری میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے۔ خدمت کا جذبہ ان کو ملکوں ملکوں سرگرداں رکھتی ہے۔ گفتگو کے دوران رسالے کی اشاعت فراہمی مواد پر گفتگو کرتے ہوئے ان کو اکثر دیکھا جا سکتا ہے۔ کسی دانشور کا قول ہے کہ اگر قیامت کا سور پھونک دیا جائے اور صرف ایک کھجور کا پیڑ لگانے کا وقت تمہارے پاس ہو تو اس کو لگا دو۔ سردار علی نے دنیا کے اس قیامت خیز ہنگاموں کے درمیان جس پودے کو لگایا تھا وہ آج تناور درخت بن چکا ہے اور اس کے ثمر سے اردو کا عالمی حلقہ مستفیض ہو رہا ہے۔

یوسف خشک

کسی ملک کی تاریخ میں تہذیب سے ہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ تہذیب کی اساس کیا تھی، کس حد تک اس میں اخذ وقبول کی صلاحیت تھی اور کس حد تک دوسرے تہذیبی دھاروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی سکت یا قوت تھی۔ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے مختلف تہذیبی دھاروں سے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے اور ہزاروں برس کی اقوام عالم کی تاریخ میں اگر آج ہندوستان زندہ ہے تو اس کا سبب اس کے مختلف علاقوں کے تہذیبی دھارے تھے، جو ایک دوسرے سے اختلافات کے باوجود مشترکہ عناصر بھی رکھتے تھے۔ ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ تھے مگر سب مل کر ایک رنگ تھا جسے ہندوستانی تہذیب کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی وجود میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں مگر سب ایک ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔ سنگم پر گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ مختلف ہوتا ہے مگر بہر حال وہ ایک ساتھ مل کر آگے کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔

کسی بھی ملک کی تاریخ، ادب یا سنسکرتی کو نزدیک سے جاننے اور سمجھنے کا سب سے اچھا ذریعہ اس ملک کی زبان ہوتی ہے ہندوستان کی خوبی اور رنگا رنگی کا اندازہ یہاں کی زبانوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے آئین اور دستور میں سبھی طبقوں اور سبھی کی آرزوؤں اور امنگوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس سے ہم آہنگی کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ہندوستان کی اتحاد اور اکھنڈتا کو مضبوطی دینے والی ہے۔ اجنتا، الورا، تاج محل اور لال قلعہ ہماری ساجھی وراثت ہیں اور ہندوستان کے سبھی افراد اس ساجھی وراثت کے امین ہیں، چاہے وہ کسی بھی زبان یا مذہب کے ماننے والے ہوں۔ عبادت کا طریقہ بدل جانے سے کوئی اپنی تہذیب سے کٹ

نہیں جا تا۔ ہماری ساجھی وراثت کی مثال ایک ایسے خوبصورت لباس سے دی جاسکتی ہے جو بولیوں اورزبانوں کے رنگ برنگے تانے بانے سے بہت ہی بار یکی کےساتھ تیار کیا گیا ہے۔ زبانوں کے تانے بانے سے تیار یہ مہین اور خوبصورت دھاگے اپنی الگ الگ پہچان رکھتے ہیں۔ان میں ہرایک کی اپنی خوبیاں ہیں لیکن ان کی خوبصورتی،ان کا سماجی رتبہ اوران کی تکمیل ایک دوسرے کے وجود پر منحصر ہے۔اوران سب کی مشترک پہچان نہ صرف ان کے اپنے وجود کو معنی دیتی ہے، بلکہ قوم کے آبرو کو قائم رکھنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

ہر دور کا ادب اپنے عہد کی تہذیب اور زندگی کا نمائندہ ہوتا ہے اوراپنے دور کی عصری حیثیت کو پیش کرتا ہے جس کا اظہار کم وبیش زندگی کے ہر شعبے میں دکھائی دیتا ہے۔اس حقیقت کو وہ لوگ بھی تسلیم کرتے ہیں جو ادب برائے ادب کے قائل ہیں اورادب کا رشتہ ذہن اور زندگی سے زیادہ کتاب اور لغت سے جوڑنا چاہتے ہیں بقول ڈاکٹر محمد حسن ''انفرادی ذہن بھی بالآخر سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور وہ ادیب بھی جو اپنی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتے ہیں دراصل زندگی ہی کے عکاس ٹھہرتے ہیں''۔ادب انسانی جمالیات اوراس کے فنی شعور وصلاحیت کا مکمل مظہر وعکاس ہوتا ہے۔انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ فنی شہ پارے کے مطالعہ کے ذریعہ خود کوسنواریں اوراس کوقدرومنزلت کی نگاہوں سے دیکھیں اور جذبے کو تکمیل تک پہنچانے اورخواہشات کو پورا کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کا استعمال کرے۔اس سلسلے میں سب سے موثر اورنمایاں مقام سیمناروں کا ہے جو شعراء، ادباء، مصنفین، ماہرین زبان وادب اور متعدد قسم کے دانشوروں کو منظر عام پر لانے میں کلیدی رول ادا کرتے ہیں، فنکاروں کو ذرائع نشر واشاعت اور قاری کوان کے نگارشات میسر نہ ہوتے تو دنیا علم وادب سے بھی واقف نہ ہوتی۔

یوسف خشک جیسے عظیم فنکار پر قلم اٹھانا یاان کی شخصیت کے خدوخال پرروشنی ڈالنا یاان کی رنگارنگی طبیعت،فطری قابلیت اور جوہر کو احاطۂ تحریر میں لانا بس کی دشوار ہی نہیں بلکہ دریا کو کوزے میں سمونے یا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یوں تو دنیا میں بے شمار لوگ

پیدا ہوتے ہیں اور گزر جاتے ہیں پر انہیں لوگوں کو عزت اور شہرت نصیب ہوتی ہے جو اپنے لیے نہیں بلکہ اوروں کے لیے جیتے ہیں جو دوسروں کے غم اور خوشی کو اپنا غم سمجھتے ہیں، جو اپنی فکری اور تخلیقی صلاحیتوں سے ادب اور سماج میں انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔ یوسف خشک کا نام نامی ایسے ہی لوگوں کے فہرست میں آتا ہے۔ انہوں نے اپنے عظیم تخلیقات، تصنیفات، نگارشات اور مختلف عظیم ادبی وثقافتی پروگرام مثلاً کانفرنس، سمینار، ورکشاپ، سمپوزیم اور دیگر کارناموں سے خود کو متحرک اور فعال رکھتے ہیں ہی اور ساتھ ہی ساتھ ان سارے ادبی کارہائے نمایاں کے ذریعہ اردو ادب کو دنیا کے دوسرے ادب پاروں کی صف میں لاکھڑا کر دیتے ہیں۔ پاکستان کی ریاست سندھ میں اردو زبان وادب کو جو پہچان دلائی ہے یہ موصوف کا ہی فیض ہے۔

سندھ کے اس مایہ ناز سپوت کا جنم ہوا تو فطرت نے انہیں ایک حساس دل عطا کیا۔ ان کا تعلق کسی مکتب فکر یا طرز فکر سے نہیں ہے بلکہ وہ بذات خود صاحب طرز ہیں ان کی تخلیقات میں فکر کی گہرائی، روش، جوہر، مواد اور احساسات وہ جذبات کی ایسی نزاکت، لطافت اور ندرت پائی جاتی ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ان کی تخلیقات کی جڑیں ان کی وطن کی اس سرزمین کی گہرائیوں میں پیوست ہیں وہ اسی زمین کی پیداوار ہیں۔ انہوں نے اس دھرتی اور یہاں کی قدیم تخلیقات کے سرچشموں سے سب سے زیادہ فیض اٹھایا ہے۔ ملک کی عظیم قدروں سے قدامت پرستی کے دامن سے ہٹ کر فیض اٹھایا ہے۔ گلے شاہ کے خوشگوار حسین وفطری نقش ونگار اور سندھی شاعری کی جذبات بھری موسیقی کے جوہروں سے دامن کو بھر لیا ہے۔ پروفیسر یوسف خشک کی شخصیت کے کئی جہات ہیں پر ان کا ہر جہت نرالہ، دلکش اور سجیلا ہے۔ وہ بیک وقت شاعر، مصور، مفکر، مورخ، صحافی، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، ناول نگار، موسیقی کار، مکتوب نگار اور انشاپرداز ہیں لیکن سب سے زیادہ ایک خوش فکر شاعر کی حیثیت سے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔ انہوں نے پوری تہذیب یافتہ دنیا کا سفر کیا۔ مگر انہیں ہر اس چیز سے دلچسپی رہی جس میں انسانی قدر رہوں اور جس کی مستقل قدر و قیمت ہو۔ کہیں کہیں انہوں نے اپنے جذبۂ عشق سے متعلق باتیں کی ہیں لیکن اپنے جذبۂ عشق کے لیے وہ ہمیشہ کے لیے اسیر نہیں ہوئے۔ اس صدی

میں مذہب اور تہذیبی خیالات میں از سرنو دقیانوسی خیالات شدت سے ابھرنے لگے ہیں دراصل زندگی کے ہر شعبہ میں انتشار کا دور دورا ہے۔ ذہنی قرب، ناآسودگی اور بے حسی سے ایک بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ شعور ادب کی ترقی میں جمود و تعطل کا شائبہ نمودار ہونے لگا ہے۔ لیکن ایسے میں چند اردو کے شعراء وادباء کے ساتھ ساتھ یوسف خشک بھی اس خوفناک طوفان کے خلاف کمر باندھے اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہیں اور طوفان کے رخ کو موڑ دینے کی آخری کوشش کر رہے ہیں۔ مگر ایک حساس شاعر کا دل ملک کے حالات سے بے خبر کیسے رہ سکتا ہے۔ وطن کی قسمت اور اہل وطن کا مستقبل ان کے در پر دستک دے رہا ہے۔ ملک کی شرمناک پستی اور خواب غفلت میں پڑے سیاستداں، افسران اور عام لوگوں سے شاعر بیزاری کا مظاہرہ اور احتجاج کر رہا ہے۔ مگر اس کا دل تڑپتا ہے وہ ملک کو اس سنہرے خوابوں کی تعبیر بخشنا چاہتا ہے جو اس نے دیگر ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ ممالک میں دیکھے ہیں اور اس کے لیے موصوف عزم وحوصلہ کا درس دیتے ہیں۔ انسان بغیر کسی مقصد حیات کے جی رہا ہے۔ اس میں خلوص واعتماد کی کمی ہے۔ اپنی تہذیب کا مذاق اڑاتے ہیں اور دوسروں کی تہذیب کی مداحی کرتے ہیں۔ اس کی نقل کرتے ہیں۔ امارت پرستی کی طرف مائل ہیں۔ مغربی تہذیب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور جو ہمارے لیے مضر اور نقصاندہ ہے۔ یوسف خشک کو ادب میں مختلف ایوارڈ، اعزاز اور انعام مل چکے ہیں جو نہ صرف ان کے ملک کے لیے بلکہ بین الاقوامی سطح پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے ملک کے ایک عظیم فنکار کی حیثیت سے نام روشن کیا ہے۔ سردست وہ شعبہ اردو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی سندھ میں اردو زبان وادب کی خدمت، درس وتدریس کے ذریعہ انجام دے رہے ہیں اور دن بدن اپنے پیچھے اپنی یادوں کے نقوش چھوڑتے جاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات روشن ستاروں کی طرح آسمان ادب پر جگمگاتی رہتی ہے۔

شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور، سندھ، پاکستان بین الاقوامی سطح پر کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے اس کی اہم خوبی یونیورسٹی میں علمی وتحقیقی ماحول اور درس وتدریس کے علاوہ ایک خاص سبب یونیورسٹی سے شائع ہونے والے اردو کے رسالہ ''الماس'' کی بین الاقوامی سطح پر مقبولیت اور

افادیت ہے۔

یہ رسالہ اپنے سفر کے تیرہ برس طے کر چکا ہے اور کامیابی کے ساتھ نہ صرف شائع ہو رہا ہے بلکہ قارئین کے سامنے نئے مواد مفاہم کے دروازے وا کرتا ہوا اردو شعروداب کی ترقی کا ضامن بنا رہا ہے۔ان سب عوامل میں حضرت انسانی کی کارفرمائی شامل ہے۔وہ اس رسالے کے مدیر ڈاکٹر یوسف خشک جو کہ بذات خود ایک اچھے محقق ادیب اور شاعر ہیں۔ان کی صحافت کا اندازہ اس رسالے کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔جہاں اتنے کم عرصے میں رسالے نے اپنے اندر بہت سے تبدیلیاں کرتے ہوئے ترقی کی راہ طے کی ہے۔

اس رسالے کا سب سے بڑا مادی پہلو یہ ہے کہ یہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ ایشیا کے تمام ممالک کے ساتھ یوروپ،افریقہ اور امریکہ میں بھی دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے۔مدیر کا بیان ہے کہ ہر سال رسالے کے قارئین میں اضافہ ہو رہا ہے جس کے لیے یونیورسٹی کا تعاون اور مجلس مشاورت کے قومی اور بین الاقوامی ارکان کو محنت اور شفقت شامل حال رہی ہے۔الماس کے دستیاب شمارہ فہم کو اگر صرف سامنے رکھیں تو اس کے سلسلے میں چند بنیادی امور پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔قارئین اور محققین کے ساتھ دنیائے ادب وزبان میں دلچسپی رکھنے والے تمام حضرات کو یہ پڑھ کر یقیناً خوشی ہوگی کہ رسالہ آن لائن شائع ہونے لگا ہے۔جو کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں سے شائع ہونے والے اردو رسالوں میں پہلا online جرنل ہے۔جس کو درج ذیل برقی پتہ www.Salu.edu.pk research publication journal almas پر دیکھا جا سکتا ہے۔الماس کے مضامین کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ دوسرے جریدوں کے مقابلے عام لوگوں سے ہٹ کر اس کے مضامین تحقیقی ہوتے ہیں جو کہ قاری کو نہ صرف مواد فراہم کرنے میں بلکہ ان کی ذہن سازی کے ساتھ بہتر سے بہتر کی تلاش کے نکلنے کی پیروی بھی کرنے میں مضمون نگار کو ہدایت ہوتی ہے کہ وہ اردو مواد کے ساتھ انگریزی کا خلاصہ بھی ساتھ بھیجیں جسے جریدہ مضمون کے آغاز میں شائع کرتا ہے تا کہ غیر اردو داں طبقہ بھی رسالے میں شامل مضامین میں کیا کچھ ہے خلاصہ کے مطالعے سے بآسانی جان سکتا ہے۔جس سے جریدہ کی قدر اور افادیت

میں اضافہ ہوتا ہے۔عصری تقاضے کے مطابق اردوادب کو عالمی پیمانے پر پیش کیا جارہا ہے۔ رسالے کے مدیر ڈاکٹر یوسف خشک کی کوشش ہوتی ہے کہ اردوادب کی تمام اصناف شاعری ونثری مضامین ایک رسالہ میں یکجا کیے جائیں گے تاکہ ہر صنف سے دلچسپی رکھنے والے اور تحقیق وجستجو کرنے والے قارئین کی تسکین پوری ہوسکے۔تمام مضامین میں جو چیز قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہیں وہ جریدے کا تقاضوں اور امکانات کے ساتھ ادب کے مختلف گوشوں سے وابستگی ہے۔ نیا ادب کیا مطالبہ کر رہا ہے اور ہمارے قلمکار کس حد تک اس پر کھرے اترے ہیں یہ کسی بھی مضمون کے مطالعے سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

الماس کے بین الاقوامی کردار کی وکالت صرف اس کی دستیابی کی بنیاد پر نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے مضمون نگار کی بڑی تعداد پاکستان سے باہر بین الاقوامی شہرت یافتہ مما لک کی ہوتی ہے جس سے کہ قاری اور قلمکار خواہ وہ کسی بھی خطے اور کسی بھی ملک کا ہو جریدہ سے اپنے آپ کو براہ راست جڑا ہوا پاتا ہے۔ڈاکٹر یوسف خشک کا یہ کام اس وجہ سے بھی باعث تحسین ہے کیونکہ اردو کے رسالوں میں چند مضامین ایسے بھی شائع ہوتے ہیں جو کہ اردو سے متعلق ہوتے ہیں لیکن ان کی زبان انگریزی ہوتی ہے۔اب یہ رسالہ نہ صرف بین الاقوامی رہ جاتا ہے بلکہ بین اللسانی بھی ہوتا ہے اس کے علاوہ لسانی طرز وفکر اور لغت سے متعلق مضمون بھی شامل کرتے ہیں تاکہ اردو کے ارتقاء اور دوسری زبانوں سے اس کے تعلق اور رابطے کی پرکھ کی جاسکے۔

نئے لکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کے اعتراف میں اس رسالے میں چند مضامین ضرور شائع کیے جاتے ہیں دوسرے یہ کہ اگر کسی دیگر رسالے کا کوئی اہم خصوصی نمبر شائع ہوا ہے تو اس کی تفصیل ''الماس'' میں شائع کی جاتی ہے تاکہ اردو کے دیگر رسالوں میں کیا کچھ اہم چیزیں شائع ہو رہی ہیں، قاری کو پتہ چلتا رہے جس سے مدیر کی اردودوستی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔اردو کتب کا گوشہ اس رسالے کا اہم حصہ ہے جس سے ایک اہم ادبی اور تحقیقی رسالہ کیونکر پیچھے رہ سکتا ہے۔

اس رسالے کی ایک اہم توجہ طلب بات یہ ہے کہ اقبالیات سے متعلق مضامین اور مواد پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے، جس سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مدیر نہ صرف اردو شعروادب کی خدمت کررہے ہیں بلکہ قارئین کے درمیان اقبال کے فکروفلسفے کی اپنے رسالے ''الماس'' کے ذریعہ اشاعت بھی کررہے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ رسالہ اپنے مضامین میں مدلل مباحث کی طرف توجہ اور تحقیقی مزاج کی وجہ سے اردو کے دوسرے صف اول کے رسالوں میں شامل ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف خشک اپنی ہمہ جہت شخصیت اور مصروفیت کے باوجود جس طرح اس رسالے کی اشاعت میں اپنا خون جگر صرف کرتے ہیں اردو دنیا اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

ڈاکٹر محمد یوسف خشک اردو کے مرد مجاہد ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ عبدالطیف یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے قیام کے علاوہ علمی وادبی نگارشات کو منظر عام پر لانے کے لیے مستقبل تگ ودو کرتے رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے انتظامی امور ڈاکٹر یوسف خشک کے مشورہ کی وجہ سے ترقی کی منزلیں طے کررہا ہے۔ خطہ سندھ جس کو آزادی کے 65 سال کے بعد بھی دوسری ریاستوں کے مقابلے امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر یوسف خشک نے سندھ کے ادب کو دریافت کیا اور اس کی ادبی اور سماجی حیثیت کو پرکھنے کی کوشش کی۔ قومی شعور کے موضوع پر انعقاد 2008 کے بین الاقوامی سمینار میں میری شرکت پر موصوف سے میری ملاقات ہوئی۔ جس میں انہوں نے مجھے شرکت کرنے کے لیے میری ضیافت میں راؤنڈ ٹرپ کے برقی ہوائی ٹکٹ عنایت کیا تھا اور کانفرنس کے دوران شاہ عبدالطیف یونیورسٹی سندھ کے اقامت گاہ میں میرا قیام رہا۔ دوران کانفرنس اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی عنایت کی۔ ساتھ ہی ساتھ تین دن کے سمینار میں ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کا پورا پورا موقع عنایت فرمایا۔ یہی نہیں کانفرنس میں مدعو تمام مندوبین کو صوبہ سندھ کے تاریخی مقامات مثلاً موہن جوداڑو، خانقاہ سچل سرمست، بے نظیر بھٹو وغیرہ وغیرہ مقامات کی دیدار اور زیارت کروائی۔ اس ضمن میں مختلف جہات پر متعدد بار برصغیر ہندوپاک کے ادبی، علمی، تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی وغیرہ موضوعات پر کھل کر پرسکون لہجے میں بات چیت ہوئی۔ اس گفتگو کی روشنی میں ان کے خیالات کے حوالے سے کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ ان کی سوچ

ہے کہ ہندوستان کو بشمول پاکستان، بنگلہ دیش ایشیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھنا چاہیے اور جنوب ایشیائی ہونے کے ناطے ہمیں فخر کرنا چاہیے۔ ہندو یا مسلمان یا ہندوستانی اور پاکستانی ہونے کی وجہ سے انہوں نے امید ظاہر کی کہ جلد ہی نئی پیڑھی جغرافیائی حدود کے تعصب اور فرقہ واریت کو مٹا دے گی اور ہندوستان اور پاکستان خیالات کی سطح پر ایک ہو جائے گی۔ انہوں نے بٹوارے کے لیے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی جگہ ونسٹن چرچل پر الزام لگاتے ہوئے کہا کہ اگر انگریز چاہتے تو بٹوارے سے بچا جا سکتا تھا۔ 1940 میں جو ہوا اسی کا نتیجہ 1947 میں سامنے آیا۔ انہوں نے مزید یہ بھی کہا کہ اگر بٹوارہ نہیں ہوتا تو جان مال کا بڑے پیمانے پر نقصان نہیں ہوتا۔ پروفیسر یوسف خشک بٹوارے کو عالمی پس منظر میں دیکھتے ہیں جس میں سامراج وادی طور طریقے کو اجاگر کرتے ہوئے برطانوی سامراج کو سیاسی اور منصوبہ بند فائدے واضح ہو جاتے ہیں۔ فرقہ وارانہ مسائل پر انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ بٹوارے سے پہلے ہی چلے آ رہے ہیں۔ ان اساطیروں کو ہمیں آپسی بھائی چارہ کے ذریعہ ختم کرنا چاہیے۔ جو دورِ حاضر میں آپسی نفاق کا سبب بنا ہوا ہے۔ تین دنوں کے دوران ان کے ساتھ گفتگو کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ چاہتے ہیں کہ برصغیر ہند و پاک کے ساتھ پوری دنیا میں امن امان قائم ہو۔ سارے ملک میں برادرانہ اور دوستانہ تعلقات ہوں اور انسانیت کو جنگ کی ہولناکیوں اور قدرتی آفات کی تباہیوں سے بچایا جائے اور پسماندہ ممالک کی مدد کی جائے، تاکہ وہ اپنے عوام کا معیارِ زندگی بلند کر سکیں۔ قیامِ امن کے لیے ضروری ہے کہ انسانی حقوق کا تحفظ کیا جائے اور مذہب، زبان، نسل یا جنس کی بنیاد پر کسی قسم کا کوئی امتیاز نہ کیا جائے۔ ان مقاصد کے پیشِ نظر انہوں نے مشترکہ طور پر مل جل کر حکمتِ عملی تیار کرنے کا مشورہ بھی دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ ہمارے ملک کے دستور میں ہر شہری کو مساوی حقوق دیئے گئے ہیں اور ان میں مذہب، ذات، جنس یا نسل کی بنیاد پر کسی قسم کی تفریق نہیں برتی گئی ہے۔ جن ذاتی، شہری، سماجی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی حقوق کی تلقین اقوامِ متحدہ کے دستور میں کی گئی ہے وہ سب ہمارے دستور میں بھی شامل ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کی روشنی میں خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے آپس میں امن و امان کا موسم اور ماحول کو فروغ دینا چاہیے۔ جس سے ان کی سیاسی اور علمی

بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سندھی ادیبوں اور شاعروں کی دریافت ان کی بڑی کاوش ہے۔ اس کے علاوہ ملکی اور بیرون ملکی سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کر کے اردو کو جدید تقاضوں کے مطابق سمجھنے اور سمجھانے کی وکالت کی ہے۔ ڈاکٹر یوسف خشک کی تحریروں کو پڑھنے سے لگتا ہے کہ ان کی ہمدردی پاکستان کے ان خطوں سے والہانہ ہیں جن کو لباس اور سماجی طور پر پسماندگی کا شکار ہونا پڑا ہے۔ جن میں سندھ اور بلوچستان سرفہرست ہیں۔ اس کے علاوہ وہ معیار تعلیم اور درس وتدریس کی جدید کاری کے لیے بھی کوشاں رہے ہیں۔ اپنی ہمہ جہت شخصیت کی وجہ سے اردو شعروادب کی خدمت کرنے والے سچے معدود چند لوگوں میں ڈاکٹر یوسف خشک کا نام عزت واحترام سے لیا جائے گا۔

اردو سنسکرت ہندو پاک کا مشترکہ کلچر اور روح ہے

کسی ملک کی تاریخ میں تہذیب سے ہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ تہذیب کی اساس کیا تھی، کس حد تک اس میں اخذ وقبول کی صلاحیت تھی اور کس حد تک دوسرے تہذیبی دھاروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی سکت یا قوت تھی۔ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے مختلف تہذیبی دھاروں سے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے اور ہزاروں برس کی اقوام عالم کی تاریخ میں اگر آج ہندوستان زندہ ہے تو اس کا سبب اس کے مختلف علاقوں کے تہذیبی دھارے تھے جو ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود مشترکہ عناصر بھی رکھتے تھے۔ ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ تھے مگر سب مل کر ایک رنگ تھا جسے ہندوستانی تہذیب کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی وجود میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں مگر سب ایک ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔ سنگم پر گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ مختلف ہوتا ہے مگر ایک ساتھ مل کر آگے بڑھتا رہتا ہے۔

کسی بھی ملک کی تاریخ، ادب یا ثقافت کو نزدیک سے جاننے اور سمجھنے کا سب سے اچھا ذریعہ اس ملک کی زبان ہوتی ہے ہندوستان کی عظمت اور رنگا رنگی کا اندازہ یہاں کی زبانوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے آئین میں ملک کے سبھی طبقوں اور سبھی لوگوں کی آرزوؤں اور امنگوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس سے ہم آہنگی کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ہندوستان کی اتحاد و اتفاق کو مضبوطی عطا کرنے والی ہے۔ اجنتا، الورا، تاج محل اور لال قلعہ ہماری ساجھی وراثت ہیں اور ہندوستان کے سبھی باشندے اس ساجھی وراثت کے امین ہیں، چاہے وہ کسی بھی زبان یا مذہب کے ماننے والے

ہوں۔عبادت کا طریقہ بدل جانے سے کوئی اپنی تہذیب سے کٹ نہیں جاتا۔ ہماری ساجھی وراثت کی مثال ایک ایسے خوبصورت اور پہلے لباس سے دی جاسکتی ہے جو زبانوں کے رنگ برنگے تانے بانے سے بہت ہی باریکی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ بھاشا روپی یہ مہین اور خوبصورت دھاگے اپنی الگ الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ہر ایک دھاگے کی اپنے رنگ ہیں، ان میں ہر ایک کی اپنی خوبیاں ہیں لیکن ان کی خوبصورتی، ان کی سماجی اہمیت اور ان کی تکمیل ایک دوسرے کے وجود پر منحصر ہے، اور ان سب کی مشترک پہچان نہ صرف ان کے اپنے وجود کو معنی دیتی ہے، بلکہ متحدہ ہندوستان کی عزت کو قائم رکھنے میں ہم رول ادا کرتی ہے۔

میرے خیال میں برصغیر ہند و پاک مہاجروں کا ملک ہے کیونکہ یہاں کی آبادی کی اکثریت ایسی ہے جن کے آباواجداد باہر سے ہند و پاک آئے تھے، جن کا رنگ، نسل، زبان اور روایات مختلف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سیکولرزم اور سب کو آزادی بہت ضروری ہے ورنہ یہ ملک نہیں چل سکتا۔ ہمارے چہار سمت پڑوسی ممالک اس کی مثال ہے۔ جہاں پیہم خون خرابہ اور تشدد کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ سیکولرزم کی بنیاد سب سے پہلے کس نے ڈالی تھی اس بحث سے پرے یہ بات مسلم ہے کہ سیکولرزم کو مضبوطی بادشاہ اکبر نے دی تھی۔ ان کے بعد دوسرے حکمراں جن میں ٹیپو سلطان اور نواب واجد علی شاہ وغیرہ بھی شامل تھے، سب کے سب سیکولر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد پاکستان میں محمد علی جنا اور دوسرے رہنما اور ہندوستان میں مہاتما گاندھی، جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، سردار پٹیل، بال گنگا دھر تلک، سبھاش چندر بوس اور ان کے ساتھیوں نے انہی کی سیکولر اور جمہوری اوصول اور پالیسیوں کو اختیار کیا اور حکومت سازی کے لیے اپنا رہنما بنایا۔ مشترکہ کلچر جو ایک طرح سے اردو، سنسکرت، پنجابی، سندھی، بھوجپوری، بنگالی، بلوچی، سرائیکی وغیرہ وغیرہ کلچر ہے ہند و پاک کا اصل کلچر ہے۔ میں یہاں ہندوستانی تناظر کی روشنی میں کہنا چاہوں گا کہ افسوس کہ ان میں سے آج ہندوستان میں اردو اور سنسکرت دونوں سے ہی ہماری نسل ناواقف ہے۔ انگریزوں نے ہندو اور

مسلمانوں کو الگ الگ کرنے کے لیے ہندی کو ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا شروع کر دیا جبکہ اردو ادب اور تہذیب مکمل طور پر سیکولر ہے۔ انگریزی، اردو، ہندی ترجمہ میں میں نے دنیا بھر کی زبانوں کی شاعری پڑھ ڈالی ہے لیکن اردو شاعری میں دل کی جو آواز نکلتی ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں دیکھی۔ افسوس کہ ہم اہل ہند اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اتنے بہترین سرمایہ کو گنوا رہے ہیں۔ اردو محض ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب کا نام ہے، جسے فنا کرنے کی کوششیں مسلسل جاری ہیں، اگر یہ زبان ختم ہوگئی تو ہم سب بھی ایسے ہی گم ہو جائیں گے جیسے جنگ آزادی میں حصہ لینے والے مجاہدین مثلاً علی برادران، مولانا آزاد، شیخ عبداللہ وغیرہ کا نام لیوا نہیں ہے۔ انگریزی اور ہندی میڈیا تو ہمیں کوئی جگہ دینے کو تیار نہیں ہے اگر اردو صحافت نہ ہو تو ہماری بات بھی لوگوں تک نہ پہنچے۔ ان حالات کے لیے ہم بھی ذمہ دار ہیں کہ ہم نے اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھائی۔ آج اگر اردو زندہ ہے تو ٹی وی سیریلز اور اس پر آنے والے متعدد کمپنیوں کے پرچار اشتہار اور فلموں کی وجہ سے یا عدالتوں میں جہاں آج بھی ملزم، مجرم، موکل، وکالت نامہ کا ترجمہ نہیں ہوا اور ''انصاف'' بھی صرف وہیں سے مل سکتا ہے۔ فلموں نے اردو کو زندہ رکھا جب مغل اعظم اور مدر انڈیا کا سرٹیفکیٹ جاری کرنے کا وقت آیا تو ان کا سرٹیفکیٹ 'ہندی' میں لینا پڑا۔ اردو کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والوں کی تقریریں بھی اردو کے اشعار سے شروع اور ختم ہوتی ہیں۔ ہندی کے اخبارات، رسائل و جرائد ہی نہیں بلکہ علمی، ادبی اور نصابی کتابوں سے اگر اردو کے الفاظ نکال دیے جائیں تو مذکورہ سارے مضامین کے موضوعات مہملات کی شکل اختیار کر لیں گی۔ دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ تو دیا گیا لیکن ہندوستان کے یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور حکومت ہند کے جملہ شعبہ میں اردو اساتذہ اور افسران نہیں ہیں۔ کیا ٹیچر اور دیگر ملازم مہیا کرانا حکومت ہند کی ذمہ داری نہیں ہے؟ ہندوستان میں ہر زبان کی ماں سنسکرت ہے لیکن وہ تو خود کتابوں میں سمٹ گئی اور مر گئی، اب ہم ملک کے مشترکہ تہذیب کا تحفہ دینے والی زبان اردو کا بھی تحفظ نہیں کر پا رہے ہیں۔ یہ سوچ غلط ہے کہ اردو پڑھ کر کوئی نوکری نہیں ملے گی بلکہ ایک سے زیادہ

زبانیں جاننے والوں کے لیے زیادہ متبادل ہوتے ہیں شرط یہ ہے کہ ہمارے اردو کے اساتذہ اور طلبا اردو کے ساتھ ساتھ اور کئی بین القومی اور بین الاقوامی زبانیں مثلاً انگریزی، ہندی، عربی، فارسی، سنسکرت، اطالوی، چینی، جاپانی وغیرہ وغیرہ زبانوں پر لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں دست عبور حاصل کریں۔ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والوں کو کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ اردو میڈیم سے پڑھائی کر کے لوگ ترقی کی بلندیوں تک پہنچے ہیں۔ موجودہ تناظر میں زبانوں کے تعلق سے ہمارا ذہن صاف ہونا چاہے۔ ایسا ہی معاملہ جنوبی ہند کی ریاستوں کا بھی ہے لیکن اردو کا اپنا کوئی صوبہ نہیں ہے۔ کشمیر میں اردو سرکاری زبان ہے لیکن وہاں کشمیریت زیادہ حاوی ہے۔ اردو میڈیم کو کم سے کم ہائر سیکنڈری تک منظور کیا جانا چاہیے۔ سہ لسانی فارمولہ پر آج تک صحیح طریقے سے عمل نہیں ہوا۔ تیسری زبان کے طور پر مانگنے پر بھی اردو نہیں دی جاتی یہ سوچ قطعی غلط ہے کہ اردو میڈیم سے پڑھ کر ہم پسماندہ رہ جائیں گے۔ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔

میرا ماننا ہے کہ تعلیم کا مقصد اعلیٰ انسانی قدروں کو استوار کرنا ہے اور اردو تعلیم کے ساتھ ہندوستان کا مستقبل وابستہ ہے۔ اس لیے کہ اردو زبان ادب کے فروغ میں ہندوستان کے ساتھ ساتھ عالمی برادری کی تمام مذاہب کے افراد نے نمایاں رول ادا کیا ہے۔ مغرب کے مادی نظام تعلیم وتربیت نے انسان کو بے راہ روی کے راستہ پر ڈال دیا ہے، جبکہ تعلیم کا مقصد صرف معلومات فراہم کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا اہم اور بنیادی کام انسان کی سیرت واخلاق کو اعلیٰ انسانی قدروں پر استوار کرنا ہے اور ایسے افراد تیار کرنا ہے جو انسانیت کے لیے نفع بخش ہوں لہٰذا ہمیں عصری تقاضے کی روشنی میں مغربی تہذیب وتمدن کا اخذ وقبول کرنا تو چاہیے مگر خیال رہے کہ ہماری مشرقی شناخت پر حرف نہ آئے جو ہماری شریعت کے لیے لفظ الف یعنی حکم کا مقام رکھتی ہے۔

عصری تقاضے کی روشنی میں میں نے دونوں نظام تعلیم اسلامی اور مغربی یعنی عصری کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس میدان میں میرا طویل تجربہ بھی ہے۔ عصر حاضر کے تقاضے کی روشنی میں

موجودہ نسل معلومات تو رکھتی ہے لیکن وہ تربیت سے بیگانہ ہے اور جب ایسے افراد تعلیم وتربیت کے میدان میں آئیں گے اور ان سے جو نسل تیار ہوگی اس کی اخلاقیات کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کس طرف گامزن ہے خیر یا شر؟۔

اردو ہندوستان کی زبان ہے اور ہندوستان کا ماضی اس سے وابستہ رہا ہے حال میں اس کا رشتہ یہاں کے عوام سے کمزور ہوا ہے لیکن خوبصورت ہندوستان کا مستقبل اردو کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے، تقسیم وطن کے بعد اس پر بہت کٹھن وقت آپڑا، آزادی کامل کا اعلان ہوا، خیالات ،افکار، مکتب فکر، مذاہب، طرز تحریر اور طرز بیاں بٹ گیا، ترسیل وابلاغ میں جمود وتعطل کا حکم ہوا۔ لہٰذا اس کے نتیجے میں اردو پر غداری کا الزام لگا، مگر یہ الزام لگانے والے صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئے، اردو آج بھی باقی ہے اس لیے کہ اس کی آبیاری میں اول تو ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے کلیدی رول ادا کیا ہے اور دوئم پوری دنیا کے قوموں کا خون جگر بھی شامل تھا اور رہے گا اس کا زندہ مثال پورے عالم میں اردو کی نئی بستیاں قائم ہو چکی ہیں اور اردو زبان وداب کا فروغ عالمی پیمانے پر ہو رہا ہے۔

پورے عالم میں آزادی کے بعد اردو کو ایک مخصوص مذہب یعنی مسلمان سے جوڑ دیا گیا جو غلط تھا اور ہے، کیونکہ اول تو اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے دوئم دیکھا جائے تو اردو عالم گیر سطح پر بین الاقوامی زبان ہے۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ صدیوں تک ہندوستان پر حکومت کرنے والا ملک برطانیہ ہندوستان پر اپنا قبضہ کرنے اور تسلط بنانے کے لیے اردو زبان وادب کا سہارا لے کر کامیابی اور کامرانی حاصل کیا۔ ہندی فارسی کا لفظ ہے اور اردو سنسکرت کا جس کے مطلب ہوتے ہیں،' ار' یعنی دل اور دو یعنی دو دل اردو دو دلوں کو جوڑنے والی زبان ہی نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے دلوں کو جوڑ کر اپنی بین الاقوامی شناخت بنا چکی ہے۔

آج کے دور میں اردو نے عالمی حیثیت اختیار کر لی ہے اس کا احساس ہمیں ہونا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پورے عالم میں اردو کو روزی روٹی سے جوڑنا اردو

زبان کی ضرورت اور تقاضے کو پورا کرنا ہے، اس لیے اردو کی ترقی اور فروغ کے لیے ٹھوس اقدام کرنے چاہیے۔ اردو زبان کی عالمی حیثیت ہونے کے باوجود بطور خاص ہندوستان میں اردو کے بانی کہے جانے والے لوگ اردو سے بے پرواہ ہیں جبکہ اس کی ترقی اور فروغ کے لیے ہمیں آگے آنا چاہیے۔ اردو لشکری زبان ہے اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہونے سے یہ ہماری زبان ہوگئی ہے۔ پورے عالم میں اس نے اپنی مٹھاس سے عام لوگوں کے دلوں کو جیتا ہے اور ہماری تہذیب وتمدن کو خوبصورت الفاظ کا لباس پہنایا ہے۔ اردو کو پستی کی طرف لے جانے میں ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔ فی زمانہ مغرب پرست اور خاص طور پر ہم مسلمان اردو کا مطالعہ تو کیا اس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم نہیں دلاتے ہیں۔ جو افسوسناک ہے۔

So every moment read, write and speak and wear the culture of Urdu, Urdu language Urdu language and literature has a long and colorful history that is inextricably tied to the development of that very language, Urdu, in which it is written. While it tends to be heavily dominated by poetry, the range of expression achieved in the voluminous library of a few major verse forms, especially the Ghazal and Nazm (poetry), has led to its continued development and expansion into other styles of writing, including that of the short story, or Afsana.

Urdu language and literature aspires to be one

of world's leading language providing innovative, responsive and high quality job opportunities all over the world. i hope to enable individuals to realize and develop to the fullest their educational and intellectual potentialities; promote social and human values in order to build a strong character, as also inculcate scientific temper and moral values; to facilitate pursuit of knowledge and academic excellence in the light of call of times.

پروفیسر غیاث الدین اور زوالِ آدم خاکی

فی زمانہ اردو ادب کا کینوس جن ادیبوں اور دانشوروں سے چمکتا اور دمکتا نظر آتا ہے ان میں پروفیسر غیاث الدین کا نام اظہر من الشّمس ہے۔موصوف بنیادی طور پر تخلیق کار ہیں مگر تحقیق، تنقید اور شاعری بھی ان کے لیے شجر ممنوعہ نہیں ہے۔ پروفیسر غیاث الدین پچھلے تین دہائی سے شعبہ اردو ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد مہاراشٹر میں درس وتدریس کی خدمات بخوبی انجام دے رہے ہیں۔جس میں وہ پچھلے ایک دہائی سے پروفیسر اور صدر کے عہدے پر فائز ہیں۔موصوف انتظامی امور میں ماہر ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بہت اچھے ادیب بھی ہیں۔مختلف موضوعات پر موصوف کی تقریباً درجنوں کتابیں اور سیکڑوں مضامین شائع ہوکر مقبول عام ہو چکی ہیں۔مزید یہ کہ موصوف اس وقت شعبہ اردو کے سربراہ ہیں۔ وہ تخلیق کار ہی نہیں بلکہ ادیب، نقاد، صحافی، مترجم، منظّم اور محقق کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔موصوف اس دور کی وہ قدر آور شخصیت ہیں جنھوں نے مردہ ادبی شریعت کی جسم میں اپنی حقیقت پسندانہ شگفتہ تحریروں کے ذریعہ نئی روح پھونکی ہے۔وہ ہماری معاشرتی، تہذیبی اور ادبی زندگی میں نشاۃ ثانیہ کا امین ہیں ان کی نظر ہمارے عہد کی علمی، ادبی اسالیب وفکریات پر اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ انہوں نے تعلیم و تدریس تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اپنے عہد کے تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند متحرک اور فعال حلقہ پیدا کیا ہے یہ حلقہ کہکشاں ہائے ادبا وشعراء کے ارفع واعلیٰ انجمن ہیں اور اس کے گرد اردو دنیا کے بہترین دماغ جمع ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ موصوف کی ادبی زندگی تین ہائیوں سے زائد عرصے پر محیط ہے ان کا عظیم اور دیرپا کارنامہ

وافر تعداد میں ہمارے سامنے ہے اور فی زمانہ کئی کتابیں زیر طبع ہیں ان کی نگرانی میں طلبا کے ایک جم غفیر ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد ہندوستان اور بیرون ممالک کے مختلف یونیورسٹیوں اور کالجز میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ پروفیسر غیاث الدین جہاں یو جی سی کے چھوٹے بڑے پروجیکٹ پر کام کیا ہے وہیں کئی اردو اداروں کی فرمائش پر اچھوتے موضوعات اور بڑے ادیبوں پر متعدد مونوگراف بھی تحریر کیے ہیں۔ وہ سیکڑوں قومی اور علاقائی سمینار میں شرکت کے ساتھ ساتھ خطبہ دے چکے ہیں۔ وہ ہندوستانی یونیورسٹی اور حکومت ہند سے ملحق اداروں کے مختلف کمیٹیوں کے سرگرم رکن خاص بھی ہیں۔ ان کے ادبی و علمی خدمات کے پیش نظر دکن ریسرچ انسٹی ٹیویٹ پونے نے ان کو توصیفی سند اعزاز اور ایوارڈ کے طور پر عنایت کیا ہے۔

ان کے طلبا جہاں بھی رہیں گے موصوف کے لیے احترام و شکر کے جذبات سے ہمیشہ سرشار رہیں گے۔ ملک و قوم کی ترقی کے لیے کتابوں کا مطالعہ نہایت ہی ضروری ہے۔ علم سے ذہنی ترقی ہوتی ہے۔ دل و دماغ کے دروازے شگفتہ ہوتے ہیں۔ ذہن میں جدید نئے گوشے کھلتے ہیں جو عصری تقاضے کو سمجھنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور ذہنی معیار بلند ہوتا ہے۔ جس سے بالآخر پوری قوم کا ذہن روشن اور بالیدہ ہوتا ہے اور ہم ایک اچھے انسان اور مثالی شہری بن جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کتابوں کے مطالعہ کی عادت بڑے بڑے مفکروں کی تحریک اور خاص طور سے بابائے تعلیم سر سید کی تحریک کے بعد بھی ابھی تک عام نہیں ہوئی۔ اس کی بہت سی وجہیں ہیں۔ جن میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ دانشوروں اور پڑھے لکھے طبقوں کو کتاب خریدنے کی عادت نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ ہمارے معاشرے میں تعلیم کا اوسط بہت کم ہے۔ جس کے ازالہ کے لیے فی زمانہ حکومت ہند کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے معاشرتی تنظیم مثلاً راشٹریہ سویم سیوک سنگھ اور دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے حکمت عملی کے ساتھ دل دام سخن تعلیم کو عام کرنے کے لیے شب و روز سرگرم اور سرگرداں ہیں۔ جو تعلیم کی جانب رجوع کرنے کے حوالے سے ایک امید افزاں علامت ہے۔ جہاں کتابیں لکھنے

،خریدنے اور پڑھنے کا ماحول پیدا ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔ اچھی کتابیں لکھنے اور پڑھنے خریدنے سے انسانی زندگی میں اشتراک کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ جو عالمی اتحاد اور انسان دوستی کی سند اور ضمانت ہے اور بین الاقوامی لحاظ سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے علمی خزانے کا احساس اور اندازہ ہوتا ہے۔ جو عالمی سطح پر امن وآشتی اور قومی یکجہتی کو بحال کرنے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔اس کی ضمانت دنیا کے سب سے بڑے انقلاب صنعتی انقلاب کے بطن سے پیدا شدہ مثبت اقدار پر محیط ہژدہ ہزار مختلف تحریکات ہیں۔ جس کی شہادت اکابرین کی مختلف کتابوں سے دی جاسکتی ہے۔ پروفیسر غیاث الدین کی ناول 'زوال آدم خاکی' اس قبیل کی ایک شاہکار ہے۔

'زوال آدم خاکی' عصر حاضر میں لکھے جانے والے ناولوں میں اس معنی میں اہم اور لائق مطالعہ ہے کیونکہ عصری اعلیٰ علمی مسائل کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔اس ناول کی تخلیق میں جس موضوع کو مرکزیت حاصل ہے وہ یونیورسٹی و کالجز کا تعلیمی واخلاقی زوال ہے۔ جاوید اور پروفیسر نسیم کے آپسی تعلقات بگڑنے پر جو واقعات رونما ہوتے ہیں وہ اخلاقی زوال کا حد ہی پار کر جاتا ہے لہٰذا اقتباس ملاحظہ ہو:

> جاوید نے جواب دیا پروفیسر صاحب دو دن پہلے آپ مجھے جانتے تھے اور آج میں اجنبی ہوگیا۔کل آپ میرے توسط سے سولہ سالہ کانونٹ میڈیم تعلیم یافتہ، دراز قد، گول چہرہ، ابھرا سینہ، پتلی کمر، باریک ہونٹ، لمبی زلفیں، باریک آواز، پتلی انگلیاں اور پانچ لاکھ نقد والی دوشیزہ کو حاصل کرنا چاہتے تھے اور آج میں آپ کے لیے انجان ہوں۔ خیر کل صبح انتظام کرنا تو مشکل ہے۔ میں کل ہی بتاؤں گا کہ کمرا کب خالی کرنا ہے۔

تعلیمی ادارے کا کردار جو کہ کسی بھی صالح سماج کی تعمیر و ترقی میں اہم حصہ ہوتے ہیں

وہی اگر طلبا وریسرچ اسکالر کا استحصال کرنے کے علاوہ بدترین عملی بددیانتی کے حامل ہوں تو ملک وسماج کے لیے کس حد خطرناک ہوسکتے ہیں کہ محمد غیاث الدین نے اپنے ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ایڈمیشن کا مہینہ آیا۔ کیمپس میں ہر طرف گہما گہمی شروع ہوگئی۔ جدھر دیکھو چار پانچ طالب علم ایک جگہ جمع ہیں اور ایڈمیشن کی بات کررہے ہیں۔ دو طالب علم ایسے تھے جن کے پاس نئے طالب علموں کی سب سے زیادہ بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ یہ دونوں کامرس میں گریجویشن کررہے تھے۔ ان دونوں سے سارے پروفیسر ڈرتے تھے ان کا ہر کام کردیتے تھے۔ جس طالب علم کا رزلٹ فی صد کم ہوتا اور داخلہ کی تمام کوشش کرکے اور پرنسپل سے بار بار مل کر تھک جاتا تو ان دونوں سے ملتا۔ یہ کہتے۔
>
> دیکھو تمہارا کام ہوجائے گا۔ لیکن اس کے لیے تھوڑا خرچ کرنا پڑے گا۔ اب ٹائم بھی بہت نکل گیا ہے اور اس پرسنیٹج پر شہر کے کسی بھی کالج میں تمہارا ایڈمیشن نہیں ہوسکتا۔
>
> 'یہی ایک کالج بچے لا ہے۔ بولو پرنسپل سے بات کروں؟'
>
> 'لیکن پرنسپل سے میں ملا تھا۔ انہوں نے کہا نہیں ہوسکتا۔'
>
> 'ارے وہ تم ملا تھا اس لیے۔ میری بات الگ ہے۔ اپن کو معلوم ہے پرنسپل ایسا کام کس طرح کرتا ہے۔ تم کو اس سے کیا لینے کا۔ تم کو ایڈمیشن مانگتا؟'
>
> 'ہاں ایڈمیشن چاہیے۔'

'تو الگ سے خرچا پانی دینا پڑے گا۔'

'الگ سے کتنا؟'

'جو ہوتا ہے۔'

'کیا ہوتا ہے۔'

'یہی کوئی پچیس ہزار'

'پچیس ہزار؟ یہ تو بہت ہے۔'

'ارے اس کو تم بہت بولتا۔ پرنسپل کو پٹانا کوئی آسان کام ہے۔ آخر اس کے بھی بیوی بچے ہیں۔ سب انگلش میڈیم میں پڑھتے ہیں۔ کالج کار سے آتا ہے۔ اس میں پٹرول جلتا ہے۔ تو کیا اس کو چاکلیٹ دیں گے؟'

'اچھا شفیق بھائی ہم دیں گے۔' طالب علم نے کہا۔

سودا طے کرنے کے بعد اس نے طالب علم سے ایڈمیشن فارم لے لیا اور کہا تم ادھر کینٹین میں جا کر بیٹھو میں آدھے گھنٹے بعد تم کو ادھر ہی ملتا۔ شفیق فارم کے ساتھ پرنسپل چیمبر میں بغیر ناک کیے سیدھا داخل ہو گیا۔ امیدوار طالب علم اپنے فارم کے ساتھ اسی چیمبر میں پرنسپل سے کئی بار گزارش کر چکا تھا۔ پرنسپل نے کہا تمہارا پرسنٹیج کم ہے۔ آخری تاریخ گزر چکی ہے۔ اب کسی صورت میں داخلہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ شخص شفیق پھر اسی پرنسپل کے پاس گیا ہے۔ خدا معلوم کیا کر کے آتا ہے۔ پرنسپل فارم پر میرا نام دیکھ کر پہچان جائے گا کہ اسے تو وہ پہلے ہی انکار کر چکا ہے۔ خیر آدھے گھنٹے

بعد دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ وہ کینٹین میں جا کراس کا انتظار کرنے لگا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ بھلا ایک بار انکار کرنے کے بعد پرنسپل فارم پر دستخط کیسے کرے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ شفیق اپنے ہاتھ میں اس کا فارم لیے اور مسکراتے ہوئے اس کی طرف آرہا ہے۔ سامنے آکر اس نے فارم میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔ یہ لو اپنا فارم۔ دیکھ لو تمہارا کام ہو گیا۔ جا کر ابھی ایڈمیشن لے لو۔ طالب نے جب فارم کو الٹ کر دیکھا تو اس پر پرنسپل کا دستخط موجود تھا۔

اس طرح مذکورہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح یونیورسٹی اور کالج میں پرنسپل اور صدر شعبہ رشوت کی بنیاد پر نا اہل طالب علموں کا داخلہ رہنما اور دبنگ طالب علموں کے ذریعہ نہ چاہتے ہوئے بھی کرنے پر مجبور ہو جا تا ہے۔ یہ ناول اپنی نوعیت کا مختلف اور اہم اس لیے ہے کیونکہ اول تو یہ کہ تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ تخلیقی شعور عام طور پر ناپید ہوتا ہے۔ تخلیق کار کا ذہن اور اس کی رسائی تعلیمی اداروں سے الگ ہوتی ہے اگر ہے بھی تو ان جیسے موضوعات کو چھونے کی آج تک کسی فاضل استاد کی نہیں ہوتی۔ کم از کم میرے ناقص علم میں تو نہیں ہے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ پروفیسر غیاث الدین کی تدریسی خدمات کئی دہائیوں پر مبنی تو ہے ہی ساتھ ہی تخلیق کار کی حیثیت سے ہمارے سامنے ان کا شاہکار ناول بھی اس صدی کا تخلیقی سند کا حامل ہے۔ ناول کا مطالعہ ومشاہدہ سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ناول کا ہیرو خود خالق ناول ہے۔ جس میں انہوں نے کالج اور یونیوسٹی میں ہورہے رشوت خوری، بدعنوانی اور بداخلاقی کا حقیقی روداد پیش کیا ہے۔ زوال آدم خا کی ایک بیانیہ ناول ہے جس میں مختلف کرداروں کے سہارے سے جاوید اپنے مرکزی کردار کے پیچ نمایاں ہے۔ مگر ہر کردار کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ طلبا کو ان کے حسب مراتب گفتگو

اور نشست و برخاست کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اساتذہ میں ہر استاد مختلف مزاج اور طرز معاملات حاصل ہے جیسا کہ ہماری حقیقی زندگی میں اکثر ہوتا ہے۔ ناول کے مطالعہ سے کہیں بھی قاری بور نہیں ہوتا ہے بلکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ یا یہ حادثہ تو اس کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ اس طرح قاری ناول کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ یہ کوئی خود ساختہ کہانی معلوم نہیں ہوتی بلکہ حقیقی روداد کی طرح محسوس ہوتی ہے اور یہ تخلیق کار کی کامیابی کا راز ہے۔

ناول نگار نے منظر نگاری میں کمال کیا ہے۔ ایسا کہتا ہے کہ آپ اس سین میں موجود ہیں اور براہ راست شاہد ہیں۔ منظر نگاری جو ناول کا اہم حصہ ہوتا ہے ایسی ہے کہ ساری تصویر آپ کے سامنے آجائے تو۔ اقتباس ملاحظہ ہو' آرٹس فیکلٹی کی تین منزلہ عمارت اپنے اندر علم و دانش کا خزانہ سمائے قومی ہیکل سفید قلعہ کی شکل میں پوری آن بان کے ساتھ تقریباً دو ایکڑ زمین پر ایستادہ تھی۔ کیمپس کا رقبہ چار ایکڑ تھا۔ پچھم میں پارکنگ اور پورب میں پی آر او آفس اور کینٹین تھی۔ شمال میں ٹیچرس کی رہائشی مکانات تھے۔ عمارت کا رخ جنوب میں تھا۔ سامنے سرسبز لان تھا۔ لان میں یہاں وہاں سمنٹ کی بینچ بنی تھی جن پر طالب علم بیٹھے تھے۔ لان کے پرے یونیورسٹی روڈ تھی۔ روڈ کے اس پار جنرل ایجوکیشن سینٹر، میوزیم، کنیڈی آڈیٹوریم اور مولانا آزاد لائبریری تھی۔ لان ،سڑک ،کنیڈی کیمپس ، لائبریری ،آرٹس فیکلٹی کے انٹرنس سیڑھیوں سے گزر کر بائیں طرف ڈین آفس اور دائیں طرف شعبہ اردو تھا'۔ ناول نگار نے جس طرح منظر نگاری کی ہے کوئی بھی شخص بآسانی اپنے آپ کو اب محسوس کرے گا کہ خود اس جگہ موجود ہے تمام عمارتوں کا رقبہ اور اس کی دوری قاری کے ذہن میں رچ بس جائیں گی۔ منظر نگاری کے علاوہ شخصیات کے خاکے جس طرح کھینچے گئے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ جسمانی ساخت، نشت و برخاست اور آرائش وزیبائش کا خیال رکھتے ہوئے کردار کے خاکے نہایت بہتر اور دلچسپ انداز میں کھینچے ہیں۔ مثلاً

'اس کے ذہن میں یونیورسٹی کے صدر شعبہ کا خاکہ تھا لیکن
یہاں کی تصویر بالکل مختلف تھی۔ گنجا سر، چٹیا منہ، موٹا جسم،

سرخ و سفید رنگ، کلین سیوڈ، بش شرٹ، پتلون اور پمپ
شو میں صدر شعبہ دھنسے ہوئے تھے۔

تخلیق کار افراد کی نفسیات سے اچھی طرح واقف دکھائی پڑتے ہیں۔انہوں نے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ایک ایک کردار کی اس کے سماجی و معاشرتی معاملات کے علاوہ آسان کی طبعی و حقیقی کردار کے سماج کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ ہر ناول اپنے آپ میں اہم ہوتا ہے مگر کسی بھی ناول کو پرکھنے کے لیے اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اس میں فنی لوازمات کو کس حد تک برتا گیا ہے۔اس طرح پروفیسر محمد غیاث الدین کا پہلا ناول ہے۔اس لیے بعض کمال اور کوتاہیاں کا رہ جانا ممکن ہے لیکن جس جانفشانی کے ساتھ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچا گیا ہے وہ اہم ہے۔اعلیٰ حلقے میں اسے بڑے شہرت و مقبولیت کو نظر سے دیکھا جا رہا ہے اور بعض تبصرے اور آراء بھی سننے کو مل رہی ہیں جو کہ تخلیق کار کو حوصلہ عطا کرتی ہیں۔

پیش لفظ کے طور پر ناول نگار نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

'ناول کے تمام کردار اور واقعات فرضی ہیں۔مماثلت کے
لیے مصنف اور ناشر ذمہ دار نہیں ہیں'۔

اپنے آپ میں منفرد اور لائق توجہ ہیں۔ساتھ ہی مصنف نے اپنے ناول کو اپنی خالہ مرحومہ کے نام مانون کیا ہے۔ یہ اپنے آپ میں دیگر تخلیق کاروں سے مختلف اختراعی عمل حسنہ ہے۔ مذکورہ دونوں باتیں ناول نگار کے غیر معمولی اہل علم ہونے کے ساتھ ایک کامیاب معلم اور تخلیق کار ہونے کے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ پروفیسر غیاث الدین کا یہ شہرآفاق ناول کی اشاعت عالمی شہرت یافتہ پبلیشر حاجی مجتبیٰ خاں (ایجوکیشنل پبلیشنگ، دہلی) کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ مضمون میں مذکورہ بالا ناول اور ناول نگار دونوں ہی کے لیے لفظ منفرد اور مختلف اختراعی عمل حسنہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ دونوں باتیں بہت ہی اہم ہیں۔اول تو یہ کہ کتاب میں پیش لفظ کا نہیں ہونا کسی بھی مبصر اور مضمون نگار کے لیے جس پر مضمون لکھنا یا تبصرہ کرنا بڑے جوکھم کا کام ہی نہیں بلکہ

آسمان سے تارے توڑنے کے مترادف ہیں۔ دوسرے ناول میں سند، دیباچہ یا سفارش کے طور پر ناقدوں اور ادیبوں کے آرا کا نہیں ہونا بہت بڑا سوال پیدا کرتا ہے۔ اس لیے کہ اردو ادب میں کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی، پریم چند، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی اور دیگر بڑے شعراء وادباء جنھوں نے اپنے تخلیقات سے اردو ادب کے گیسوؤں کو سنوارہ ہی نہیں بلکہ اردو ادب کو بین الاقوامی سطح پر پیش کیا۔ ایسے لوگوں نے اپنی کتابوں میں پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی یا نہ کسی سے سفارش کے طور پر کچھ لکھوایا۔ اب اس وقت جب پروفیسر غیاث الدین ان بڑے تخلیق کاروں کا تتبع کرتے ہوئے اپنے ناول زوال آدم خا کی تخلیق کر کے منظر عام پر لائے ہیں۔ اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ فی زمانہ پروفیسر غیاث الدین کو ان بڑے ادیبوں کے مقابلے میں کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

ارریہ کی تاریخ وتہذیب

ارریہ غیر یقینی کیفیات کا حامل ہونے کے باوجود، تاریخی اعتبار سے عظیم الشان حیثیت رکھتا ہے۔ مہابھارت کے کچھ حصوں(sabha parva, vana parva) میں اس ضلع سے متعلق، مشرقی ہندوستان میں بھیم کی فتح کے کارنامے کا ذکر قابل قدر معلومات فراہم کراتا ہے۔ ارریہ کو تین مختلف تہذیبوں وثقافتوں کا مرکز بھی کہا جا سکتا ہے۔ شمال پر kiratas قبائل کی حکمرانی تھی جبکہ مشرقی احاطہ کے ماتحت pundras تھے۔ دریائے کوسی کے مغربی علاقے میں angas کی حکومت تھی اور یہیں ان کی سب سے زیادہ آبادی تھی، یہ اس ضلع کے سب سے پرانے باشندے کے طور جانے جاتے ہیں۔ angas قبیلے کا ذکر آریاؤں کی atharva-samhita میں موجود ہے۔ pundras کو saint vishwamitra کی اولاد سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ kiratas اس وقت کے چند اہم حکمرانوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ مہابھارت کے راجا virata نے ایک kiranti عورت سے شادی کی تھی جو کہ kiratas کے بادشاہ Raja kichaka کی بہن تھی۔ منو، kiratas کو kshatriyas مانتے ہیں۔ kiratas مہابھارت کے kirata parva, اور Vanaparva میں دستیاب ہیں۔ وہ بہت زیادہ طاقت ور مانے جاتے تھے، ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی طاقت کی بنا پر بھگوان شیو نے kiratas کی شکل اختیار کر لی تھی۔ موریہ کے وقت میں یہ علاقہ موریہ سلطنت میں شامل تھا۔ sokavadana کے مطابق اشوک نے اس علاقے میں بدھ مت کی خلاف ورزی کرنے والوں کو یا بدعت کرنے والوں کو موت کے

گھاٹ اتار دیا تھا۔ بعد میں علاقہ گپت سلطنت میں شامل ہوا۔

مشہور چینی سیاح ہیون سانگ نے 640AD میں یہاں کا دورہ کیا اور یہاں کے علاقے اور لوگوں کے بارے میں مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔اس کے مطابق یہاں کی آبادی اس وقت بہت خوشحال تھی۔کھیتی کے لیے فضا سازگار تھی، زمین ہرے بھرے تھے اور آب وہوا خوشگوار تھی۔ پورے شہر میں درختوں، ٹینکوں اور مسافر خانوں کی بہتات تھی۔ قدیم ہندوستانی تاریخ کے مطابق بہت صدیوں پہلے نیپال کے راستے سے داخل ہوئے مہانندا ندی کے مغربی علاقے میں Vrijus نامی قبائل نے اس علاقے کی بنیاد ڈالی جو کہ آج Araria کہلاتا ہے۔ساتویں صدی کے شروعاتی دنوں میں یہ ضلع Gauda کے طاقتور بادشاہ Sasanka کے زیر تھا۔ وہ بھگوان شیو کا پجاری تھا اور بدھ مت کے ماننے والوں سے نفرت کرتا تھا اس نے بدھ مت کے مذہبی درسگاہوں کو برباد کر ڈالا اور یہی وجہ تھی کہ بدھ بھکشو نیپال کی پہاڑیوں کی طرف منتقل ہو گئے۔

ساتویں صدی کے عظیم الشان بدھ حکمراں ہرشا، نے سسانکا کو شکست دی۔کہا جاتا ہے کہ ہرشا کی موت کے بعد ارریہ ادتیہ سین کی حکمرانی میں مگدھ سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔

نویں صدی سے بارہویں صدی تک ارریہ پالہ بادشاہوں کے قبضے میں رہا لیکن ان کے زوال کے بعد بنگال کے سیناؤں نے گدی سنبھالی۔ بارہویں صدی کے آخری دنوں میں بختیار خلجی کے مسلمانوں نے بنگال اور بہار پر قبضہ کیا۔بختیار خلجی نے حکومت لکھنو منتقل کر لیا اور یہیں سے غیاث الدین ایواز نے پورے بنگال اور بہار میں مسلمانوں کی حکمرانی قائم کی۔غیاث الدین ایواز کی حکمرانی کو ساتھ ہی ٹرہٹ اور آس پاس کے علاقوں میں بھی سراہا گیا۔لیکن بعد میں ایسا معلوم ہوا کہ جنگل کے ایک بڑے احاطے تک ناقابل گزر دریاؤں کے نظام کے پھیلے ہونے کی وجہ سے پورنیہ ضلع کے شمالی حصے میں جو کہ آج ارریہ ضلع کا موجودہ علاقہ ہے، مسلمانوں کے اقتدار والے علاقے کو مزید وسعت نہ مل سکی۔ گرچہ موجودہ ارریہ ضلع آج بھی نیپال کے قبائیلوں سے متاثر ہے۔اٹھارویں صدی تک اس علاقے میں شمالی قبائیلوں کی حکمرانی رہی۔1738ء میں

جلال گڑھ کے شمالی علاقے سے جوگبنی تک کے علاقے کو افغان عامر کے بیٹے نواب سیف خان نے جو کہ پورنیہ کا فوجی گورنر تھا مورنگ کے راجپوت بادشاہوں سے فتح کرلیا۔سیف خان نے راجا نندلال کو اس نئے علاقے کے انتظامیہ کی دیکھ ریکھ کے لیے تقرر کیا،نندلال نے مدن پور میں بھگوان شیو کے مندر کی بنیاد ڈالی۔سیف خان نے پہاڑی قبایلیوں کو ترائی والے علاقے میں منتقل کر دیا اور جنگلوں کی کٹائی کروا کر کھیتی کے لیے وہاں کی زمین کو سازگار بنایا۔سیف خان نے بیرنگر کے سردار کو شکست دی اور اس کی ریاست پر قبضہ کرلیا۔بیرنگر میں دریائے کوسی کا مغربی علاقہ بھی شامل تھا۔آج وہ سارا علاقہ رانی گنج،بھرگاما بلاک اور کچھ حصہ نرپت گنج میں پڑتا ہے۔

1770ء تک اس علاقے پر پورنیہ کے نوابوں کی حکمرانی جاری رہی ،حالانکہ 1765ء میں یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دیوانی میں آ گیا تھا۔اسی سال ایک برطانوی نگراں Mr G.G.Duccarel کی پورنیہ میں تقرری ہوئی،جو کہ بعد میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور کلکٹر کے عہدے پر فائض ہوا۔

ارریہ کی تاریخ سے متعلق چند خاص واقعے:1738ء میں سیف خان نے موجودہ ارریہ ضلع کو اپنے حکمرانی میں شامل کرنے کے بعد اسے پہلے سے اس علاقے پر حکومت کر رہے پورنیہ کے راجہ کے حوالے کر دیا۔یہ خاندان متھلا کے شوتریا برہمن کے سرگم لوآم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔انہوں نے اپنا انتظامی مرکز رانی گنج کے قریب پٹارا میں نسب کیا تھا۔مغل بادشاہ شاجہاں کے وقت میں مہاراجہ سمر سنگھ نے اس سلطنت کی بنیاد رکھی سمر سنگھ کے بعد اس کے بیٹے کرشنا دیو نے گدی سنبھالی اور اس کے بعد وشوناتھ، ویرنارائن، نارائن، رام چندرن اور اندرا نارائن جنہیں مہاراجہ کی حیثیت حاصل تھی گدی سنبھالی، سب سے آخری مہاراجہ اندرا کی موت 1784ء میں ہوئی اس کی موت کے بعد اس کی بیوی مہارانی اندراوتی حکمراں کی حیثیت سے فائز ہوئی۔اور اس نے اپنے آخری دنوں 1803ء تک حکمرانی کی۔عصر حاضر کے انگریز مصنفوں نے اسے بہت ہی لائق حکمراں کی حیثیت سے پیش کیا۔اس کی انتظامیہ میں جو علاقے شامل تھے ان

میں سلطان پور پرگنہ، سری پور، ناتھ پور، گوراری، کاٹیہار، گوندوارا، تیرا کرداہ، اسجا اور دیگر علاقے شامل تھے۔ اندراوتی نے بہت سے مندر اور محل تعمیر کروائے جو کہ اب مٹ چکے ہیں ان میں سے ایک مندر رانی گنج بلاک کے بیساتی گاؤں میں آج بھی باقی ہے۔ یہ مندر بھگوان شیو کی نظر میں اندراوتی نے بنوایا تھا۔ مہارانی اندراوتی کی کوئی اولاد نہیں تھی اور اس کی موت کے بعد گدی کے لیے خاندان میں لڑائیاں شروع ہوگئیں۔ اندراوتی نے اپنے ماما کے بیٹے بھیاجی جھا کو گود لیا تھا اور اسے ہی اپنا جانشیں قرار دیا تھا، لیکن مہاراجہ سمر سنگھ کے دوسرے بیٹے راجا بھاگیرتھ جو کہ سورایا خاندان کے جانشینوں میں سے تھا، مہارانی کی عظیم ریاست پر دعویٰ کیا، لہذا ان دونوں کے بیچ لڑائی شروع ہوگئی۔ 1815ء راجا بھیاجی جھا اپنے ایک بیٹے وجے گوندا کو چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ وجے گوندا کو اس ریاست کا راجہ بنا دیا گیا۔ اس کے دو بیٹے تھے، کمار وجے گوپال سنگھ اور کمار بھاؤ گوپال سنگھ۔ ان دونوں کو کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وراثت کی لڑائی میں مہارانی اندراوتی کی ریاست کا زوال لازمی تھا۔ 1820ء میں اس ملکیت کو مرشدہ آباد کے خزانچی بابو پرتاپ سنگھ و پورنیہ شہر کے راجا اور پی سی لال کے دادا بابونک چھیدی لال نے خرید لیا۔ پرتاپ سنگھ نے سلطان پور اور سری پور پرگنہ کو خرید لیا لیکن اس کے بعد اس کے جانشینوں نے سلطان پور کے پرگنہ کو الیگزنڈر جون فوربس کو بیچ دیا۔ الیگزنڈر فوربس ایک فوجی جانباز تھا اور اس نے شمال مغرب ہندوستان کے جراتمندانہ اقدام میں حصہ لیا تھا۔ 73 ویں فوجی علاقائی جنگ کے وقت وہ بھاگلپور کے کمشنر یول کے ٹیم میں بھی شامل تھا۔ اس نے سلطان ریاست کی بنیاد ڈالی اور ساتھ ہی ضلع کے مختلف علاقوں میں نیل کے کارخانے بھی لگوائے۔ آج جو علاقہ فوربس گنج کے نام سے جانا جاتا ہے وہ ان کے ہی نام پر ہے۔

نیپال کے بین الاقوامی سرحد سے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس علاقے کے ضلع انتظامیہ کو سرحد پار سے ہونے والی پریشانیوں کی وجہ سے ہمیشہ خاص توجہ دینی پڑی ہے۔ برٹش حکمرانوں کے وقت نیپالی سرداروں نے ہمیشہ اس علاقے پر حملہ کیا، 1770ء میں

D.Duccare جو کہ پورنیہ کا کلکٹر تھا۔اس نے خبر دی کہ بدھا کرن (راجا کام دت سنگھ کے جانشینوں کا دیوان تھا) کمپنی کی سرحدوں میں لوٹ کھسوٹ مچانے کی وجہ سے وہاں کے باشندے در بدر ہو رہے ہیں۔لہذا duccarel نے مشورہ دیا کہ Regonault کو فوجی مدد فراہم کی جائے تا کہ وہ بدھا کرن کے خلاف لڑائی میں کامیاب ہو سکے۔اس وقت شمال سے مذہبی فقیروں اور ڈکیتوں کے ذریعہ لوٹ پاٹ بھی ایک بہت بڑا مسئلہ تھا، یہ ڈکیت لوٹ پاٹ کرنے کے بعد مورنگ میں چھپ جاتے تھے۔لہذا ضلع انتظامیہ نے شمال سے ہونے والی ان پریشانیوں کی وجہ سے سخت قدم اٹھایا۔O.malley کے مطابق نیپالیوں کی حملہ آوری ایک صدی تک جاری رہی۔ 1808 میں morung کے گورکھا گورنر نیز بھیم نگر کی پوری زمینداری پر قبضہ کرلیا۔یہ واقعہ کافی شرمناک تھا اور اس کا جائزہ نہیں لیا جاسکا، 1809 میں پورنیہ سے سرحد کے علاقوں میں فوجی دستے بھیجے گئے۔

نتیجہ کے طور پر 1812-1811 کا ہند نیپال جنگ سامنے آیا اور اسی جنگ کے بعد موجودہ سرحد ہندوستان اور نیپال کا تعین کیا گیا۔ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران ارریہ میں باغیوں اور کمشنریوں کے فوجیوں کے درمیان جنگی جھڑپیں بھی ہوئیں۔ 1857 کے حالات کے تناظر اور دوسرے قانونی اور ترقیاتی کاموں کو دیکھتے ہوئے 1864 میں انتظامیہ کو بہتر بنانے کے لیے ارریہ کے چھوٹے علاقوں جیسے متی ہاری، دیمیا، حویلی کے کچھ حصے، بہادر گنج کو شامل کر کے اسے سب ڈویزن بنا دیا گیا، اور 1990 میں یہ ایک ضلع بن گیا۔ برٹش حکومت کے وقت میں وہ علاقہ جہاں فوربس کا بنگلہ تھا وہ R sidential کے نام سے جانا جاتا تھا، جسے لوگ R.area کے نام سے جاننے لگے ،اور ایک وقت کے بعد یہی علاقہ لہجہ بدلنے پر (R.AREA) ارریہ کہا جانے لگا۔Forbesganj ارریہ ضلع کا ایک Subdivision ہے (1990 سے پہلے یہ پورنیہ ضلع میں تھا)۔اس شہر کا نام Mr. James Forbes کے نام پر پڑا۔وہ برٹش انڈیا راج کا افسر تھا، اس کی پیدائش لندن میں ہوئی تھی اور وہ 1765ء میں

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مصنف کی حیثیت سے بمبئی آیا اور وہاں 1784ء تک رہا۔ وہ ایک اچھا نقشہ نویس اور باریک مشاہدین تھا۔ انہوں نے قدرتی تاریخی آثار قدیمہ اور ہندوستان کی سماجی و مذہبی زندگی پر 52000 دستی تحریری صفحہ لکھا، جسے بعد میں 1813-1815ء کے درمیان Oriental Memoirs میں شائع کیا گیا۔ یہ کتاب دنیا بھر میں اہم دستاویز کے طور پر اس وقت کے ہندوستان کی تہذیب اور نباتات کی اہم نمائندگی کرتی ہے۔ فوربس نے 1810ء میں ایک اور کتاب شائع کیا جس میں ہندوؤں کے عیسائی مذہب کو قبول کرنے کی تائید کی گئی ہے۔

آزادی کی لڑائی میں ارریہ کی خدمات:

ارریہ ضلع میں ہندوستان کی آزادی کی تاریخ سنہرے حرفوں میں لکھی گئی ہے۔ 1857ء کی پہلی جنگ آزادی سے 1942ء کے اگست کرانتی تک ہر موقع پر ارریہ کے باشندوں نے اس ملک کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ تاریخی صفحات کے مطابق 1857ء میں ہندوستانی فوجی دستوں نے ارریہ ضلع کے ناتھ پور میں انگریزوں کی بندوقوں کا ڈٹ کر سامنا کیا، لہٰذا ارریہ کے جنگجوؤں نے اودھ کی بیگم حضرت محل کی حفاظت کی خاطر نیپال کے چھترا گدی علاقے میں کوسی ندی کو پار کیا۔

پنڈت رام دینی تیواری دوجدینی:

ارریہ ضلع میں انہیں تحریک آزادی میں حصہ لینے والا سب سے پہلا شخص قرار دیا گیا ہے۔ پنڈت دوتج دینی اور بابو بسنت سنگھ نے فوجی جنگجوؤں کی تشکیل کی، جو کہ انگریزوں کے لیے ایک پریشان کن بات تھی۔ ارریہ ضلع کے بھودھر گاؤں کے رام لال منڈل گاندھی جی کے کارندوں میں سے تھے، ان کی آواز بہت سریلی تھی اور وہ گاندھی جی کے لیے رامائن کا پاٹھ کرتے تھے۔ یہ وہ اہم نام ہیں جنہوں نے آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں پنڈت راما دھار دیویدی، کنھیا لال ورما، کملا نند بسواس، دھنش دھاری چودھری، ہری لال جھا، ناگیشور جھا، بدھی ناتھ ٹھاکر، سوریہ نند ساہ، پھنیشور ناتھ رینو، بودھ نارائن سنگھ اور گنیش لال موجود تھے۔

بالی ووڈ میں ارریہ کا اہم کردار:

راج کپور کی فلم تیسری قسم 1966ء میں بنی تھی، جس میں راج کپور اور وحیدہ رحمان کی کردار نگاری پیش کی گئی تھی۔اس فلم کی کہانی اسی علاقے کے باشندے جناب فنیشور ناتھ رینو کے ناول مارے گئے گلفام سے لی گئی ہے،اس فلم کی شوٹنگ ارریہ میں کی گئی ہے۔باسو بھٹا چاریہ کی ہدایت کاری اور نبیند و گھوش کی سکرین پلے سے لیس اس فلم نے ہندی فلموں کی تاریخ میں کامیابی کی منزل طے کیا ہے۔اس فلم میں ہندوستان کے دیہات کے لوگوں کی سادگی کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔اس فلم کو 1967 کے بین الاقوامی موسکو فلم فیسٹیول میں گرینڈ پرکس اوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا تھا۔

آوٗ ٹرم لین - ایک نظر میں

کہا جاتا ہے کہ ناول زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ ہمعصر زندگی کے نشیب و فراز کو جس عمدگی سے ناول میں سمیٹا جاسکتا ہے دوسری کسی صنف میں نہیں۔ اس بات کی صداقت یوں بھی مستند ہے کہ ہر زبان میں اس کی مثالیں موجود ہیں اور اردو ادب میں تو تاریخ نویسی کی ایک کامیاب کوشش بہ اسلوب فکشن عینی آپا کرچکی ہیں اور اس کوشش میں اس قدر کامیاب ثابت ہوئیں کہ انہیں اردو فکشن کا سیارۂ زحل قرار دیا گیا۔ بہرحال اس وقت میرے پیش نظر ایک ایک ایسا مختصر ناول ہے جس کی مصنفہ کا تعلق اس نئی نسل سے ہے جس پر یہ الزام عاید ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی جودت سے بیگانہ ہوچکی ہے۔ 132 صفحات پر مشتمل اس ناول کا عنوان ''آوٗ ٹرم لین'' ہے جو دہلی یونیورسٹی نارتھ کیمپس کے قریب واقع مکھرجی نگر کا وہ محلّہ ہے جہاں مسابقاتی امتحان بطور خاص آئی اے ایس اور آئی پی ایس کی کوچنگ کے لیے سارے ہندوستان میں مشہور ہے ناول نگار چونکہ اس محلّہ میں خود رہی ہیں اس لیے وہاں کے ماحول کا نہایت باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔ خود کوچنگ اور امتحانات کی تیاری کی ہے لہٰذا نوجوانوں کے شب و روز سے واقف رہی ہیں۔ ایک گاؤں سے تعلق ہونے کی وجہ سے زیادہ تر طلبہ جن کا تعلق دیہی معاشرے سے ہوتا ہے کہ معاشی صورتحال کا اندازہ لگانے میں بھی مصنفہ کو دشواری نہیں ہوئی ہوگی لیکن پورے ناول کی کہانی کو نیلوفر نے جس خوبصورتی سے مربوط کیا ہے وہ اپنے آپ میں قابل ستائش ہے۔ ناول نگار کی اس جرأت کو بھی داد دینی ہوگی کہ انہوں نے اس سے قبل تخلیقی ادب کے طور پر ایک کہانی بھی نہیں رقم کی اور سیدھے سیدھے ناول لکھنے پر آ گئیں اور جو تحریر پکی روشنائی میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی اسے پڑھکر یہ قطعی اندازہ نہیں ہوتا کہ محترمہ نو وارد ہیں۔ موضوع کے اعتبار

سے بھی یہ ناول منفرد ہے اور نہایت کامیاب کوشش بھی جس کے ذریعہ آزادی کے بعد قائم ہونے والے ہمارے معاشرے میں رائج سسٹم پر زبردست تنقید کی گئی ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ جمہوری طرز حکومت کے نام پر ہمارے ملک میں نوکرشاہی رائج ہے لیکن انتظامیہ کو کنٹرول کرنے والے یہ آفیسران جس ٹکسال سے نکل کر آتے ہیں اس ٹکسال کی حقیقت اس ناول کے ذریعہ کھولی گئی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''ویسے تم کیا سوچتے ہو کہ جولڑکے دس بیس نمبروں سے رہ جاتے ہیں وہ بالکل اتنے گدھے ہوتے ہیں کہ ان کو ٹیچر کی نوکری بھی آفر نہ کی جائے بکواس ہے یہ سارا سسٹم۔ایک ہی لڑکا کبھی P.T تک میں نہیں آتا اور کبھی فائنل میں ٹاپ کرجاتا ہے۔۔۔سرکار لاٹری چلاتی ہے لاٹری۔ایک ہزار کو چننے کے لیے چارلاکھ نوجوانوں کو ریگستان میں لاکر چھوڑ دیتی ہے جہاں نہ پینے کا پانی ہوتا ہے نہ ہی سر پر کسی پیڑ کا سایہ۔ ہم جیسے لوگ دماغ رکھنے کے باوجود چوہے کی طرح گرم ریت میں بل کھودنے پر مجبور ہوجاتے ہیں''۔

ناول نگار نے معاشرے کی بےحسی کو پوری طرح بے پردہ کردیا ہے اور نہایت سفّا کی سے وہ تمام حقائق اجاگر کردیئے ہیں جو اس صارفیت زدہ سماج کا زائیدہ ہے اور جس پر اس عہد کو فخر ہے نوجوان نسل کو گمراہ کرنا اسی طرح کا سنگین جرم ہے جیسا جرم دہشت گرد انجام دے رہے ہیں لیکن ملک کے دل میں کھلے عام نوجوانوں کو منزل سے دور لے جا کر زندہ درگور کردینے کا کام نہایت باوقار انداز سے ہورہا ہے اور پورا معاشرہ نیز حکومت خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ڈاکٹر نیلوفر نے ''آؤٹرم لین'' میں حقائق کو کہانی بنا کر پیش کیا ہے۔ یہ ایک انقلاب کی چنگاری بھی ہوسکتی ہے لیکن اس معاشرے میں اس کی امید قطعی نہیں کی جاسکتی جس معاشرے میں پشیمانی و گناہوں کے احساس سے

ترجبینوں کو محنت کش قرار دیا جائے۔لیکن ایک تخلیق کار نے اپنا کام بھی کر دیا ہے اور اپنے فرض کی ادائیگی بھی نہ صرف یہ بلکہ بلند و بانگ دعوے کرنے والی ایک نسل کو یہ آئینہ بھی دکھا دیا ہے کہ۔

پیروں تلے گر زمین ہوتی
پھر ہم بھی کوئی کمال کرتے

سردارعلی کی ادبی وصحافتی خدمات

ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ زمانے کی روش ورفتار، معاشرے کے میلان ورجحان، تہذیبی ثقافتوں اور عمرانی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اردو زبان وادب نے ہر دور میں رفتار زمانہ کا ساتھ دیا ہے۔ اس نے زندگی کے اچھے پہلوؤں اور اخلاقی تصورات کو ابھارنے میں بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ اور قدم قدم پر خارجی محرکات سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہیں رہا ہے۔ اور شعروادب صرف قلعوں اور محلوں کی فصیلوں کے اندر پروان نہیں چڑھا اور نہ ہی دریاؤں تک محدود رہا بلکہ اس نے عوام کے دل کی دھڑکنوں سے ہمیشہ رشتہ قائم رکھا۔ بزم ہستی میں رب کی قدرت کے مظاہر کا شمار نہیں۔ ہر صدی اور ہر زمانے میں ایسی ملتی ہیں۔ جو انفرادی شان کے ساتھ اس کارگاہ حیات میں جلوہ افروز ہوئی ہیں۔ ان میں کوئی ایسا امتیازی جوہر ہوتا ہے۔ جو نمایاں نظر آتا ہے اور وہ اسی جوہر کے باعث اپنے معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ بیسوی صدی میں دنیا نے جتنی عظیم ہستیاں پیدا کیں ہیں بلاشبہ سردار کو ان میں اک اہم مقام حاصل ہے۔ میں اسی نابغۂ روزگار عبقری شخصیت پر اپنے خام قلم کی روشنائی صرف کرنے جا رہا ہوں۔ دنیا جنہیں بابائے قوم کے نام سے جانتی ہے۔ یہ ایک عقیدت مند کا غلو نہیں دور حاضر کے اہل نظر، دانشور نکتہ ہیں اور مردم شناس حضرات کا فن فقہ حتمی رائے ہے۔ سردار علی عالم اسلام ومسلمان کے ان دانشوروں میں ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کے علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی نظریوں اور انتظامی امور کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور اخلاقیات کا ایک ایسا مکمل اور روشن خاکہ مرتب کیا ہے جو رہتی دنیا تک اس کا شاہکار رہے گا۔ ان کی نظریات نے ہندوستانی ذہن کی تعمیر میں غیر معمولی حصہ لیا ہے۔ سردار علی نے نہ صرف انسانی ذہن کی تعمیر کی بلکہ ان کے ادبی کارنامے کے

مطالعہ کی روشنی میں کہا سکتا ہے کہ وہ اپنے کسی معاملے میں اپنی رائے جان بوجھ کر تبدیل کرتے ہیں تو تبدیلی صاف طور پر نظر آتی ہے البتہ دھیان سے دیکھنے والی آنکھ ہی ارتقاء کے اس عمل کو دیکھ سکتی ہے۔سردار علی کا مقصد سچائی کی اس صورت حال سے مطابقت قائم رکھتا ہے جسے وہ کسی خاص لمحے میں دیکھتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں سچائی کی تلاش میں زیادہ کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لیے جس انداز فکر کو اختیار کیا اس بارے میں وہ فرماتے ہیں میں مستقبل کا حال جاننے کا خواہش مند نہیں ہوں۔میرا تعلق زمانہ حال سے ہے۔خدا نے مجھے آئندہ ہونے والے واقعات کو کنٹرول کرنے کی طاقت نہیں دی۔لیکن حال کے لمحوں سے عملی تعلقات ہی درخشاں مستقبل کی بنیاد ہے۔ہمارے چاروں طرف جو گہرا اندھیرا ہے۔وہ لعنت نہیں بلکہ رحمت ہے۔خدا ہمیں صرف ایک قدم آگے تک دیکھنے کی طاقت دی ہے۔اگر ہمیں خدا کی رحمت سے اتنی روشنی میسر آجائے کہ ہم اتنا فاصلہ دیکھ لیں تو یہ ہمارے لیے کافی ہوگا۔دوسرے الفاظ میں یہ اندھیرا اتنا گہرا نہیں جتنا ہم سمجھتے ہیں یہ اسی وقت زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔جب ہم بے صبری کے عالم میں ایک قدم آگے کا حال معلوم کرنا چاہتے ہیں۔وہ اعتقاد رکھنے والا انسان ہے اس کا بھروسہ خدا پر ہے۔اس کے لیے ایک قدم بڑھانا ہی کافی ہے۔اور جب وقت یاد آتا ہے تو خدا خود ان پر یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ اس کا دوسرا اقدام کیا ہونا چاہئے۔وہ خود کو ایک ادنی انسان سمجھتا ہے۔جو پوری طرح اچھا، سچا بننے کی اور خیال، قول اور عمل میں ہمیشہ عدم تشدد پر کاربند رہنے کی جدوجہد کر دیا ہے۔ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی طاقت نہیں جو کہ سچائی پر زور دینے سے حاصل ہوتی ہے۔وہ خوبصورتی کو سچائی میں اور سچائی کے ذریعہ ہی سے دیکھتا ہے۔ تمام سچائیاں نہ صرف سچے خیال ہیں بلکہ سچے چہرے سچی تصویریں دیکھ نہیں پاتے۔عام انسان اس سے دور بھاگتا ہے۔ اور اس میں پہچان اور خوبصورتی اسے نظر نہیں آتی جب لوگ سچائی میں خوبصورتی پہچاننا شروع کر دیں گے تو صحیح آرٹ پیدا ہوگا۔میری رائے میں سردار علی کی شخصیت ایسی ہے کہ جو اپنی طبعی اور جسمانی سفر کے بعد بھی رہتی دنیا لاتعداد آدمیوں، تصویروں اور صحیفوں کی

ہیئت میں زندہ رہیں گے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ہر مذہب کے ماننے والے اپنے مذہب کا تبلیغ کرنے کا حق ہے۔ مذہب کی بنا پر کسی سے امتیاز نہیں کرسکتا۔ گو عمل کی دنیا میں یہ بات آسان نہیں ہے مگر اصول زندگی کا نصب العین ہو تو عملی دنیا میں اس خیال کو رفتہ رفتہ رائج کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہمارے ان قومی رہنماؤں اور مشاہیر میں سے ہیں جو اپنے پیشے میں انہماک اور امتیاز کے باوجود قومی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی فلاح و بہودگی کی پے ہر تحریک میں ہر گام پر حصہ لیا ہے وہ جداگانہ انتخابات اور اقلیتوں کی مناسب تحفظات کے پرزور حامی ہیں۔ شعروسخن چونکہ قومی اور ادبی تعلیم کی نصب العین لے کر سامنے آئی اس لیے وہ اس کی دامے، درمے سخنے، قدمے خدمت کررہے ہیں۔ قومی نقطہ نظر کے ساتھ وہ اردو ادب اور مسلمانوں کے جائز مطالبات کی برابر حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے شعروسخن کے نام سے انسانوں کو ایک ایسا نسخہ عطا کیا ہے جو بلاشبہ عالم انسانیت اور اردو ادب کے لیے آیت نجات ہے وہ ایک عملی انسان ہیں، ماضی پرستی ان کے یہاں آخور کا تحفہ ہے اور وہ نہ ہی ٹھوس اور ناقابل تردید حقائق سے روگردانی کرتے ہیں۔ زمانے کی برق رفتاری اور بھاگ دوڑ نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اجازت ہی نہیں دیتی اور ہونا بھی یہی چاہیے، اس لیے کہ تیز رفتار افراد اور قوموں کی نگاہیں ہمیشہ مستقبل کے لافناہی امکانات ہیں۔ نئے منزلوں کی متلاشی رہتی ہیں۔ ان کی شخصیت با اثر ہے کہ ان کی رائے کو نظر انداز کرنا آسان نہیں۔ سردار علی انسانیت کے پرستاد ہی نہیں علمبردار ہیں، وہ عالمی قومیت پر یقین رکھتے ہیں مگر قومیت کا ان کا تصور ہندوستانی کا نہیں ہے وہ ہماری مشترکہ تہذیب کے شاندار مظہر ہیں۔ وہ ہندو مسلم سکھ اور عیسائی اتحاد کے لیے مدام کوشاں رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو علیحدگی پسندی سے بچنے کی ہمیشہ تلقین کرتے ہیں۔ اردو مسلمانوں کے مسائل سے ان کی گہری دلچسپی ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ سچی قوم پرستی اور سچا ادب اور جمہوریت، اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرے اور قومی رہنماؤں زندگی کا نصب العین بنائیں۔ جو ہماری قومی زندگی کی تعمیر میں نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں کے حقوق کی پاسداری

ان کی فلاح و بہبودگی کے امکانات کوضروری سمجھا ہے۔سیکولرتصور رفتہ رفتہ وظیفہ لب سے بڑھ کر طرز زندگی بننے لگا ہے۔اس سے انسانوں خاص کر مسلمانوں کو سردار علی کی زندگی اور کارنامے سے ولولہ اور امنگ حاصل کرنا چاہئے تا کہ سچی قومیت اور سچی جمہوریت کی منزل تک پہنچ سکیں۔

اردو کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم چند سکہ رائج الوقت قسم کے ناموں کے پیچھے دوڑتے ہیں ان کی طرف کم دیکھتے ہیں۔ جو شہرت بلندیوں پر نہیں ہوتے مگر ایک خاص پیرایۂ اظہار ایک خاص مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ کہ ''خوش درخشید والے مستعجمل بود'' کے مصداق سردار علی اسی زمرے کے اسکالر ہیں انہوں نے اپنی تخلیقات میں سینۂ صحرا لہو کی لکیر کھینچ کر بہار کے یہ راستہ ہموار کیا ہے، یعنی انہوں نے اپنی ادبی کارنامے کے ذریعہ انسانوں کو اس قدر محنت کرنے کی دعوت دیتے ہیں کہ مفلسی کا خاتمہ ہوا اور ہر گھر میں دن عید رات شب برات ہو۔اقبال نے عصر جدید کے شامی مسلمان کا جو تصور مرد مومن کے نام سے اپنے کلام میں اور گاندھی جی نے مرد حق کا جو نمونہ اپنی زندگی میں پیش کیا ہے۔ان دونوں کی جیتی جاگتی شبیہ مجھے اور میری طرح اور بہت سے لوگوں کو سردار علی کی شخصیت میں نظر آتی ہے۔ سردار علی فقہ کے میدان میں بھی مجتہدانہ فکر کے حامل ہیں۔انہوں نے ہمیشہ انسانوں کو اس جانب متوجہ کیا ہے اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہر زمانہ میں نئے نئے مسائل ابھرتے ہیں۔ان کے بارے میں شریعت کا نقطۂ نظر متعین کرنے کے لیے اجتہاد کا طریقہ اپنانے کی ترغیب دیتے ہیں۔اسلامی تاریخ کے اولین ادوار میں فقہی مسائل کے حل کے لیے اجتماعی غور وفکر کا معمول پر رہا ہے۔اور یہ کہ فقہی مذاہب کے ظہور کے بعد اس میدان میں امام ابوحنیفہ کی خدمات سب سے زیادہ نمایاں رہی ہیں۔انہوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ آج کے دنیا میں درپیش مسائل کے حل کے لیے مسلم پرسنل لاء بورڈ اسلامی فقہ اکادمی کے توسط سے یہ طریقہ اختیار کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ ماضی میں فقہا نے مسائل کے حل کے لیے اجتماعی غور وفکر اور اجتہاد کا طریقہ اختیار کرنے کی بہت سی مثالیں چھوڑی ہیں۔بہتر ہوگا کہ موجودہ دور کے علما ان سے سبق حاصل کرتے ہوئے ملت اسلامیہ کے لیے درپیش مسائل کا حل

تلاش کریں اور ثابت کریں کہ شریعت ہر دور میں قابل عمل ہے۔اور اس کی اتباع میں ہی انسان کی بھلائی اور کامیابی ہے۔

سردار علی کی شاعری کا انتخاب بھی بہت خوبصورت انداز میں شائع کیا گیا ہے۔اس انتخاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سردار علی آزادانہ انتخاب ہے۔شعری یا نثری ادب کا انتخاب ہمیشہ آزادانہ ہی ہونا چاہئے۔انتخاب کے لیے مزید اچھا اور نہ ضروری ہے کہ ادب کا ہر قاری یا ادیب انتخاب کی جانب سے ہمیشہ آزادانہ مطمئن ہو کیونکہ اس طور پر آزادانہ انتخاب کے پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی ہیں۔اور انتخاب کے پاؤں میں بیڑیاں پڑ جائیں تو وہ انتخاب نہیں بلکہ مخصوص لکھنے والوں کا اشتہار بن کر رہ جاتا ہے۔سردار علی انتخاب اشتہار نہیں ہے واقعی انتخاب ہے ہماری نظر میں شاعری کا یہ بڑا ہی نمائندہ اور مستند انتخاب ہے۔سردار علی ادبی دنیا میں ادیب ،صحافی ،نقاد، مصلح اور بے شمار اصلاحی کام کرنے والوں میں خود ہی ایک انتخاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔وہ باہر سے نہیں اندر سے شاعر ہیں ان کے لیے بڑے واقعات کے ساتھ ساتھ معمولی سی معمولی چند علامت بن کر وسیع شاعری کا موضوع بن جاتا ہے۔خدایان سخن و پیمبران فن سردار علی نے صرف زبان وادب کی بڑی خدمتیں انجام نہیں دیں۔ بلکہ انتہائی عظیم الشان انسانی ،اخلاقی اور تہذیبی خدمتیں بھی انجام دی ہیں۔ان کی عظیم شعری اور نثری روایت، ایمانی استحکام کے ساتھ ساتھ روحانی، روشن فکری، رواداری اور عام انسانی ہمدردی کے اقدار کی حامل اور انہیں پروان چڑھانے والی ادبی وشعری روایت ہے۔جس کی بطور خاص آج دنیا کو شدید ضرورت ہے۔لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم موصوف اور ان کی طرح دیگر عظیم فنکاروں کے لسانی، ادبی، شعری اور فنی عطیات کی حقیقی فکر ذاتی کا ثبوت دیں اور اپنی جانب سے عرفان جمیل کا قرار واقعی حق ادا کریں۔ انہوں نے اردو کے جملہ اصناف کے پیرایہ میں مناظر قدرت کی تمام موضوعات مثلاً کثیرمات، نباتات، جمادات پر طبع آزمائی کی ہے اور بنی نوع انسان سے متعلق مسائل خوشی وغم ہر لمحات کو بڑی چابکدستی اور خوبصورتی سے پرویا ہے۔موصوف نے اپنی شاعری میں بے شمار موضوعات قائم

کیے۔مثلاً لغت،تندبسی،داستاں دلیر ودلدار۔۔۔ہر موضوع کے تحت آنے والے اشعار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا ہمارا شعر ہر ایک عالم دیوان رکھتا ہے یہ ایک ایسا مرقع ہے جس میں ذی فہم کے ساتھ ساتھ خاص وعام مسائلوں کا حل موجود ہے۔سردارعلی نے اپنی شاعری کے ذریعہ اردو مثنوی میں جاری جمود تعطل کو اپنے نوک قلم سے توڑا ہے جو جوئے شیر لانے سے یا ہفت خورہ طے کرنے سے کم مشکل کام نہیں جبکہ پرانی تہذیب دم توڑ رہی ہے۔اورنئی تہذیب ابھی قائم نہیں ہوسکتی ہے۔اس نیم تعطل کی وجہ طبیعتوں میں انتشار پیدا ہوگیا ہے۔اس انتشار کے ہوتے ہوئے مثنوی لکھنا مشکل ہوگیا ہے۔منظوم افسانے یا کہانیاں مثنویوں کی شکل میں یا تو لکھے ہی نہیں گئے۔اور جو لکھی گئی ان کی ادبی خوبیوں سے افکار نہیں کیا جا سکتا۔یہ مثنویاں منظوم افسانوی ادب کی ایسی مثالیں ہیں جس میں سادگی تسلسل اور روانی کے ساتھ ساتھ ایک سرحد اور یانکپن معصومہ ہے۔انجیل مقدس میں کہا گیا ہے کہ ہوا جس سمت چاہتی ہے کہ اپنا رخ کرتی ہے ہم اس کی سنسناہٹ سنتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ آ کہاں سے رہی ہے۔یہی حال ادب کا ہے منظوم افسانوں یا مثنوی کو نیند ضرور آ گئی ہے اور یہ عبدیت بھی رہی ہے کہ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔اور کہا جائے تو شاید غلط ہوتا کہ یہ خواب مثنوی خواب دائمی ہے۔کون جانے مثنوی کب جاگ اٹھے اور کس کروٹ سے جاگ اٹھے۔مثنوی کی پرانی تکنیک اور موجودہ تقاضوں کے مطابق نئی تکنیک پر عبور حاصل ہے۔انہوں نے نئے مطالبوں سے بھر پور مثنویاں قلم بند کیے ہیں۔ادب آزاد ہائے بازگشت کا ایک سلسلہ ہے۔سردارعلی کی مثنویاں میر حسن اور نسیم کی مثنویاں سے مختلف ہیں۔سردارعلی ہومر،ورجل،ڈانٹے،ملٹن،فردوسی اور تلسی دام کے کارناموں سے بخوبی واقف ہیں اس کے علاوہ غیر انسانی بلند شاعری اور منظوم ڈراموں کا بھی انہوں نے گہرا مطالعہ کیا ہے۔مثنوی کی نشاۃ ثانیہ کے خلاف صرف ایک امکان ہے اردو میں جس طرح آزاد نظم ترقی کر رہی اسے دیکھتے ہوئے اس کا امکان زیادہ نظر آتا ہے کہ مستقبل میں منظوم افسانہ لکھنے والا شاعر اپنے کارناموں کے لیے آزاد نظم کا سہارا لے۔اس مختصر مضمون میں راقم کے لیے ممکن نہیں کہ سردارعلی کی طویل ادبی خدمات کا جائزہ لے

سکوں۔انہوں نے اردوتحریک اوراردوزبان کی بقااورترقی کے لیے اہم ترین خدمات انجام دی ہیں اوراردو والوں کی رہنمائی کی ہیں۔اردو کے سلسلے میں وہ کسی سے بھی نہ تو مفاہمت اورمصالحت کا تصورروا رکھتے ہیں۔اورنہ کسی طرح کی مصالحت کو بروئے کارلاتے ہیں اردو سے انہیں جنون کی حد تک محبت ہے،شعروسخن کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا ہے۔موصوف کا شمار صف اول کے شعراء میں ممکن نظرآتا ہے۔انہوں نے گہوارۂ علم وادب میں آنکھ کھولی۔بہت ہی کم عمر سے وہ دنیائے شعروادب سے متعارف ہوچکے تھے۔نثرنگاری میں ان کی تحریریں اپنی سادگی اور پرکاری کی بنا پر عام موضوعات پر لکھنےان کے مضامین کی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے۔ان کی نثرنگاری پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔سردارعلی بحیثیت شاعر بڑے مثنوی نگار،نظم نگار یا غزل گو ہیں۔اس کا تعین آنے والا وقت کرے گا۔ہاں یہ ضرور ہے کہ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ قومی،وطنی اورسیاسی نظموں پر مشتمل ہے۔اردو ہمیشہ سے عوامی زبان رہی ہے اوراس زبان نے ہرعہد اور ہردور میں عوام کا ساتھ دیا ہے۔اردوشاعری کا وہ باب جوقومی وطنی اور سیاسی نظموں پر مشتمل ہے۔اس وقت تک جگمگاتا رہے گا جب تک اردوزبان زندہ ہے جوکبھی فنا نہیں ہوسکتا۔اردوشاعری کا یہ حصہ ہمیشہ امر رہے گا۔

اردوشاعری اپنے ہردور میں وطن دوست رہی ہے۔اور وطن سے سرشار اردوشاعری میں ہندستانیت اتنی زیادہ رچی بسی ہوتی ہے اور بڑی تعداد میں ایسی نادرمثالیں موجود ہیں۔جوزبانوں کے تعلق سے ہندوستان کے لیے انتہائی فخرونازکی بات ہے۔ہندستان کی تمام زبانوں میں مشترکہ تہذیب وتمدن قومی یکجہتی اوروطن دوستی کی بنیاد ڈالنے اس کی لے کو بام عروج پر پہنچانے اور نئے گنگا جمنی معاشرہ کوجنم دینے والی اردوزبان ہی ہے۔اردوشاعری نے عوام اور خواص کے احساس غلامی کو بہت بڑھا دیئے۔ہرموڑ پر اردوشاعروں نے نہایت زوردار نظمیں لکھیں چاہے وہ سب سے بڑی جنگ عظیم جنگ آزادی ہو یا اس کے دوسری جنگ عظیم،سیاسی مذاکرات اور ہمہ گیر بغاوت کے رجحان ومیلان پر اردو میں موثر ترین نظمیں لکھی گئیں انقلاب زندہ باد کا نعرہ جس شدت سے

اردو شاعری میں گونجا، وہ ہندوستان کی تاریخ جنگ آزادی کا نہایت زریں باب ہے۔ اردو کی قومی اور سیاسی شاعری کا تیسرا رخ اور باب ہائے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ سردار علی کی یہ وطنی قومی اور سیاسی نظمیں اسی تیسرے دور کی پیداوار ہیں۔ سردار علی نے بھی اس روایت کو آگے بڑھانے کی مقدور بھر پور کوشش کی ہے۔ آزادی ملنے کے بعد قومی ملکی اور سیاسی مسائل کچھ زیادہ ہی ہنگامی تشویشناک اور فکر انگیز اور المناک رہے ہیں۔ سردار علی قومی ملکی اور سیاسی مسائل میں کچھ زیادہ ہی زور رنج واقع ہوئے ہیں۔ ان شاعری میں شامل عوام الناس کی پسندیدگی کے حامل اور مقبول نظمیں اور مثنویاں انا کے ان ہی احساسات کا ایک جاوداں روپ ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں پاتا کہ موصوف کی شاعری پر کوئی سیر حاصل نقد و تبصرہ کرسکوں۔ سردار علی اس بزم ہستی کے ہر دلعزیز ہیں اور ہندوستانی عوام کے محبوب بن کر جی رہے ہیں۔ موصوف کے اس شعری مجموعہ کی داد سچ مچ یوں دی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری کا مطالعہ کرنے والے ہر گھر میں ان کی شاعری پڑھے اور اہل ذوق اپنی توجہ کا مرکز بنائے۔ موصوف کے لیے اگر میں یہ کہوں کہ وہ اردو کے گنے چنے چند حقیقی شاعروں میں سے ایک ہیں تو مجھے کوئی خوف تردید نہیں ہے۔

سردار علی اردو شاعری کا بے حد معتبر اور معزز نام ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کی کئی جہات ہیں کئی پہلو میں ایک سے ایک زیادہ تابناک اردو کے علاوہ وہ پنجابی شعر و ادب میں بلند و بالا مقام مرتبے کو حاصل کر چکے ہیں انگریزی ادب کے وہ معلم رہے ہیں تاعمر اور اس زبان پر انہیں قدرت کاملہ حاصل ہے۔ اسی نسبت سے ان کی رسائی دنیا بھر کی دیگر زبانوں کے ادب تک رہی ہے اور انہیں یہ کماحقہ طور پر معلوم ہے کہ ادبی دنیا میں نئے نئے رجحانات وان کی پیش رفت کس نوعیت کی ہے اس لحاظ سے وہ ایک عالم باعمل کے روپ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ فی زمانہ وہ بے حد باقاعدگی اور بے انتہا انہماک سے اردو شاعری میں تخلیقی کام کرتے رہے ہیں اردو شاعری سے ان کی وابستگی بہت پرانی ہے اور یہ کہنا بالکل برحق ہے کہ عمر ''عمر گزری ہے اسی دست کی شیاحی ہیں''، جن لوگوں کو ان کے اردو کلام کو سننے کی سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ اس

میدان کے شہ سوار میں اوران کا کلام ایک استادانہ پختگی اور شان کا حامل ہے ان کے بیان کی بے ساختگی و برجستگی اور زبان کی سلاست اور روانی اس نوعیت کی ہے کہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ایسے شاعر کا کلام ہے جس نے خداداد استعداد کے ساتھ ساتھ بے پناہ ریاضت سے یہ کام انجام دیا ہے جس کی نظر شاعری میں حسن بیاں اور حسن معنی دونوں پہلوؤں پر یکساں ہے اور جو اپنے اس کام کو اولیت دیتا ہے اور جس کے لیے یہ کام ایک Tabour of love ہے۔میں شہرہ آفاق فرانسیسی نقاد سینٹ بیو کے اس مقولے سے پوری طرح متفق ہوں کہ صرف ایک اعلیٰ شخصیت ہی اعلیٰ ادب تخلیق کرسکتی ہے۔اگر یہ بات ایک کلیے کے طور پر قابل قبول نہ بھی ہو تو بھی سردار علی کی حالت میں یہ بات صدفی فیصد برحق ہے۔ان کی شخصیت اور شاعری میں کوئی تضاد نہیں ان کی شخصیت کی عکاس ہے۔زندگی کی وہ اعلیٰ وارفع اقدار جن کی جھلک آپ کو بار باران کی شخصی زندگی میں ملتی ہے انہیں کا پرتو ان کے مروت، وہی شائستگی وہی متانت ورواداری، وہی شگفتگی اور حوصلہ مندی جو ان کی شخصیت کو اتنا دل پذیر اتنا پرکشش بناتی ہیں ان کی شاعری میں جگمگاتی دکھائی دیتی ہیں۔ان کی شخصی زندگی سے متعلق سوچتے ہوئے مجھے انگریزی ادیب Stevenson کا ایک فقرہ یاد آیا ہے۔'ایک شخصیت جس کے کسی محفل میں آتے ہی یوں محسوس ہو کہ گویا ایک اور موم بتی روشن کردی گئی ہے۔اس کمرے کی روشنی میں ان کی موجودگی صرف موجودگی سے اضافہ ہوگیا ہے'۔

میرا جی دیدہ ور نقادوں کی نظر میں

(1912-1949)

روز ازل سے تغیر و تبدل قدرت کا خاصہ ہے اور ابد تک رہے گا۔ اس عمل کی تکمیل میں ہم انسانوں کا کلیدی رول کارفرما رہا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ انسانی وجود جس اربع عناصر کی خمیر سے وجود میں آیا ہے۔ ان چاروں چیزوں کی خاصیت مسلسل رواں دواں ہے۔ جس کے نتیجہ میں تغیر وتبدل کا یہ قدرتی نظام جاری وساری رہتا ہے۔ ہر عہد کی اپنی قدریں اور تقاضے ہوتے ہیں۔ جو بتدریج بدلتے ہوئے عہد کے ساتھ تبدیل بھی ہوتے رہتے ہیں۔ قدروں اور تقاضوں کی یہ تغیر پذیری ایک طرف رجحانات ومیلانات کی تبدیلی کا سبب بنتی ہے تو دوسری طرف سیاسی وسماجی حالات اور فکری تخلیقی عمل کا تعین بھی کرتی ہے۔ لہٰذا تغیر وتبدل کا فرق تو نہ صرف موضوعاتی سطح پر نمایاں ہوتا ہے بلکہ اس کی جھلک ہیئتی سانچوں میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس ضمن میں اردو شعر وادب بہت ہی متحرک اور فعال رہا ہے۔ یونان کے کلاسکی تحریک سے لے کر اب تک وجود میں آنے والے تحریکات اس کی زندہ مثال ہے۔ جس کے ذریعہ دنیا کے بیشتر ممالک اور سماجی تعمیر اور امن وامان کو اپنا نصب العین بنایا۔ ہمارے ملک ہندوستان میں آزادی کی تحریک ہندوستانی عوام کو امن وامان عطا کرنے کی غرض سے شروع ہوئی جس کا آغاز تو خوشنما تھا مگر انجام اچھا نہیں ہوا۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہندو پاک کی شکل میں ہے۔ تقسیم کو آج 65 سال ہو چکے ہیں۔ اس کا مفید ومضر ہمارے سامنے ہے کہ تقسیم ہند کے تہذیبی ومعاشرتی مسائل کی پیچیدگیاں بدلتے ہوئے سیاسی حالات کے پیش نظر نہ صرف قومی ہم آہنگی اور اتحاد باہمی کے لیے وقتاً فوقتاً خطرہ بن جاتے ہیں بلکہ سیاسی معاشی وسماجی قدروں کی شکست وریخت کا موجب بھی

بنتے رہتے ہیں۔ ہمارے شعراء واد باء خواہ دنیا کے کسی بھی خطے عرض پر بستے ہوں وہ اس طرح کے نفرت ونفاق اور پیچیدگیوں سے مبرا زندگی گزارتے ہیں اور اپنے تخلیقات عوام الناس کے مسائل کو پیش کرتے رہتے ہیں۔ دنیا کے تمام شعراء واد باء نے بین الاقوامی سطح پر ذات، مذہب، ملت اور جغرافیائی حدود سے مبرا ہوکر اپنے تفکرات کو قلم بند کرتے ہیں۔ ہمارے 20ویں صدی کے افق پر ابھرتے ہوئے نہایت ہی روشن خیال شاعر میراؔجی اسی قبیل کے اہم شخصیات میں سے ایک ہیں۔ جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ زیر نظر مضمون میں شامل اقتباسات ویسے تو عموماً میرے تحقیق وتفحص اور عمیق مطالعہ ومشاہدہ کا نتیجہ ہے۔ خصوصاً ''میراؔجی شخصیت اور فن'' مرتبہ کمار پاشی زیراہتمام پریم گوپال متل سے نقول کردہ ہیں۔ میرے اس مضمون کے مطالعہ سے میراؔجی کی شخصیت اور فن کس قدر اجاگر ہوا ہے اس کا فیصلہ قاری کرے گا مگر میرے اندازے کے مطابق میں نے بین الاقوامی سطح پر میراؔجی کی شخصیت فن اور تفکرات کو اعلیٰ سطح پر بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے اور اردوادب کے بڑے ادباء اور شعراء اور شخصیات کے اقوال کی روشنی میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، ثابت کیا ہے کہ میراؔجی کس قدر حددرجہ بلند مرتبہ کی شخصیت کے مالک تھے۔ موصوف کی زندگی اور ادبی کارناموں کے حوالے سے قومی مجلس برائے تعلیمی تحقیق، نئی دہلی سے شائع شدہ مضمون میں بنیادی معلومات کچھ یوں فراہم کیا گیا ہے۔

میراجی کا اصلی نام ثناءاللہ ڈار تھا۔ وہ ایک کشمیری خاندان میں گوجرانوالہ (اب پاکستان) میں پیدا ہوئے ان کا زیادہ وقت لاہور، دلّی اور ممبئی میں گزرا۔ ممبئی میں ہی ان کا انتقال ہوا۔ وہ انتہائی ذہین انسان تھے۔ مطالعہ کا شوق بے حد تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مختلف زبانوں کی شاعری کے تراجم کیے اور ان پر تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھے۔ جدید تنقید میں میراجی کا نام بہت بلند ہے۔ انہوں نے بہت سے قدیم وجدید ہندوستانی شعراء پر تنقیدی مقالات لکھے۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ خیالات وتجربات پر مشتمل ہے۔

وہ لاہور کی ایک مشہور ادبی انجمن ''حلقہ ارباب ذوق'' کے بانیوں میں تھے جس نے

بہت سے ذہنوں کو متاثر کیا اور شاعری میں جدید رجحانات کو فروغ دیا۔ انہوں نے اختر الایمان کے ساتھ مل کر رسالہ ’’خیال‘‘ نکالا۔

میرا جی کی ’’نظموں‘‘ کے کئی مجموعے مثلاً، میرا جی کی نظمیں اور گیتوں کا مجموعہ ’’گیت ہی گیت‘‘ ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ ایک مجموعہ ’پابند نظمیں‘ اور انتخاب ’تین رنگ‘ بعد میں شائع ہوئے بہت بعد میں پاکستان سے ’’کلیات میرا جی‘‘ (مرتبہ جمیل جالبی) اور باقیات میرا جی، (مرتبہ شیما مجید) شائع ہوئے۔ نثر میں دو کتابیں ’مشرق و مغرب کے نغمے‘ اور ’اس نظم‘ شائع ہوئیں۔ جامع اردو انسائیکلوپیڈیا میں میرا جی کے سلسلے میں اہم معلومات موجود ہے۔

میرا جی کا نام ثناء اللہ ڈار تھا۔ ان کے والد منشی مہتاب الدین ریلوے انجینئر تھے۔ ملازمت کی وجہ سے مختلف جگہوں پر قیام رہا۔ میرا جی کی تعلیم بھی مختلف مقامات پر ہوئی اور ادھوری رہی۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا۔ پہلے سامری تخلص کرتے تھے۔ لاہور کے قیام کے دوران ان کی زندگی ایک انقلاب سے دوچار ہوئی۔ میرا سین نامی ایک لڑکی سے عشق نے انہیں میرا جی بنا دیا۔ وہ مولانا صلاح الدین کے رسالہ ادبی دنیا سے وابستہ ہوگئے۔ وہاں سے دہلی آئے تو آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں چند سال رہنے کے بعد ممبئی واپس چلے گئے۔ اور ممبئی کے ہی ایک اسپتال میں انتقال کیا۔

میرا جی کی زندگی نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہی۔ وہ سماج کی مروجہ اقدار سے منحرف تھے۔ میرا جی اردو شاعری میں ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے شاعری میں ایک نئی روایت قائم کی۔ ان کا سارا زور انسان کی باطنی شخصیت اور انفرادی تجربوں پر تھا۔ تحلیل نفسی سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ہندی فلسفے، اساطیر اور موسیقی سے بھی متاثر تھے۔ دنیا بھر کی عشقیہ شاعری کا بغور مطالعہ کیا۔ خاص طور پر فرانس کے انحطاطی شعراء کا انہوں نے تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ میرا جی کی اہمیت ایک خاص طرز احساس کے علاوہ ہیئت کے تجربوں کی وجہ سے بھی ہے۔ وہ طبعاً ایک باغی شاعر تھے۔ میرا جی کی شاعری کا ایک پہلو وہ بھی ہے جسے اشاریت اور ابہام سے تعبیر کیا

جاتا ہے۔نظموں اور غزلوں کے علاوہ میراجی کے گیت اور ان کی تنقیدی تحریریں بھی اہم ہیں۔ نثری مضامین کے مجموعے اس نظم میں اور مشرق ومغرب کے نغمے کے نام سے شائع ہوئے۔ (جامع اردو انسائیکلو پیڈیا حصہ اول ادبیات، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی ،صفحہ 533) صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اپنے ایک مضمون بعنوان اردو نظم کا آغاز وارتقا میں میراجی کی حلقہ ارباب ذوق سے وابستگی کا ذکر کرتے ہیں۔ عبیدالرحمٰن ہاشمی نے میراجی کی شعری ہیئت کی فہم وبصیرت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردو نظم کے ارتقا میں میراجی کا نام اہم ہے۔میراجی نے اردو نظم کو ہیئت اور طرز دونوں کے اعتبار سے یورپی نظموں کے بلند معیار سے اہم آہنگ کرنے کی شعوری کوشش کی۔میراجی کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔انگریزی، فرانسیسی، امریکی، جرمنی اور روسی زبانوں کی شاعری کا مطالعہ کیا تھا۔ان زبانوں کی کئی نمائندہ نظموں کا منظوم ترجمہ بھی کیا۔میراجی کی نظموں میں جنس ایک اہم موضوع رہا ہے۔انہوں نے اپنی نظموں میں جنسی موضوع کو بھرپور انداز میں برتنا شروع کیا۔ان میں نظم کروٹیں، دھوبی کا گھاٹ، ایک شام کی کہانی، دوسری عورت اور اخلاق کے نام وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں جنسی الجھن کا موضوع پست سطح سے بلند ہو کر اس دور کی اجتماعی زندگی میں ایک اہم پہلو کا مظہر ہو جاتا ہے۔جنسی جذبہ جب شکست آرزو کی ارفع صورت میں ڈھل جاتا ہے تو پرتاثیر نظمیں وجود میں آتی ہیں۔اس سلسلہ میں نارسائی، کٹھور، مجھے گھر یاد آتا ہے، مجاور، دور کنارا، عدم کا خلا قابل ذکر ہیں۔ان نظموں میں دوری کی اذیت، شخصی محرومی، غم انتظار، ذہنی تلاش اور ذوق تپش کا بیان ملتا ہے۔اجنتا کے غار قدرے طویل نظم ہے۔بعد کی اڑان، اندھا طوفان، فاختہ، کوا وغیرہ علامتی نظمیں ہے۔اونچا مکان میں ایک فاحشہ کی قابل رحم زندگی کا بیان ملتا ہے۔کلرک کا نغمہ، محبت میں کلرک کی مجبور زندگی کے ادھورے خوابوں کا سیدھا بیان ملتا ہے۔

میراجی نے اردو نظم کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔اردو نظم کے مزاج میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کی۔میراجی کے بعد ان کے طرز فکر اور انداز بیان

کے اثرات کئی جدید نظم نگاروں میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ میرا جی کی نظمیں جدید نظم کے ارتقا میں ایک اہم موڑ کا پتہ دیتی ہیں۔

برقی مجلّہ شعر و سخن (ایڈیٹر سردار علی، کناڈا) میں شائع حیدر قریشی (جرمنی) کا مضمون بعنوان میرا جی شخصیت اور فن (ڈاکٹر رشید امجد کا پی ایچ ڈی کا مقالہ) کے شروع میں ہی یہ مندرجہ ذیل تحریر درج ہے جو میرا جی کی شخصیت اور فن کو اجاگر کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

ادبی دنیا میں آنے سے پہلے اپنی ٹین ایج میں میرے پسندیدہ شاعر وہی شعراء ہوتے جو ٹین ایجرز کے سدا بہار شاعر ہیں۔ لیکن انہیں شاعرں میں ان شاعروں سے یکسر مختلف میرا جی بھی شامل تھے جنہیں میں نے ٹین ایج میں ہی حیرت کے ساتھ پڑھا تھا۔ ان کا شعری مجموعہ ''تین رنگ'' مجھے کہیں سے ملا تھا اور میں نے اس کی نظمیں، گیت اور غزلیں اسی عمر میں پڑھ لی تھیں۔ یہ غالباً 1969ء کا سال تھا۔ (عمر 17 سال) جب میں نے میرا جی کو کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا مگر کوئی انوکھا سا شاعری ذائقہ ضرور محسوس کیا۔ تب جہاں میں نوکری کرتا تھا، اس ملز میں لیبارٹری کے دوستوں کا بیت بازی کا مقابلہ ہوا تھا اور اس میں سب سے زیادہ میرا جی کے شعر پڑھے گے۔ بیت بازی کا فیصلہ میرا جی کی غزل نے کرایا۔

گناہوں سے نشوونما پا گیا دل
در پختہ کاری پہ پہنچا گیا دل

لام سے شروع ہونے والے اشعار ختم ہوگئے اور

میراجی کی اس غزل کے شعرا بھی باقی تھے۔اسی
کتاب میں ایک نظم غالباً ''خلا'' کے عنوان سے تھی۔

خدا نے الاؤ جلا یا ہوا ہے
اسے کچھ دکھائی نہیں رہا ہے

میراجی کی شاعری میں جنس ایک ایسا موضوع ہے جس کا ذکر کیے بغیر میراجی کی شاعری کو مکمل سمجھنا دشوار ہے۔ میراجی کی جنسیات کو جنسی تلذذ پر محمول کرنا بڑی غلطی ہوگی جیسا کہ بعض لوگ ناسمجھی میں کرتے ہیں حیدر قریشی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''جنس کا حوالہ میراجی کے ساتھ اس طرح چپک گیا ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ میراجی کا سارا مسئلہ جنس ہی ہے اور انہوں نے دوسرے مسائل کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ عام لوگ میراجی کو ان افسانوں اور ان پر ہونے والے سطحی اعتراضات ہی کے حوالے سے جانتے ہیں۔ حالانکہ میراجی نے اپنے مضامین میں جس سیاسی اور سماجی شعور کا اظہار کیا ہے اور ان کے مضامین جس طرح برصغیر کی سیاسی ،سماجی اور اقتصادی صورتحال کا احاطہ کرتے ہیں وہ شعور ان کے بہت کم ہم عصروں کو حاصل تھا۔ میراجی نے اپنے مضامین میں برصغیر کی اقتصادی صورتحال کے جو تجزیے کیے ہیں وہ ان کے عہد کا بڑے سے بڑا ترقی پسند بھی نہیں کرتا (میراجی شخصیت وفن از کمار رپاشی ،موڈرن پبلشنگ ہاؤس ،نئی دہلی)۔ میراجی کے ادبی مقام کے تعین میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں۔

''میراجی کے یہاں مادیت اور ماورائیت کا جو امتزاج نظر آتا ہے۔وہ انہیں اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے منفرد وممتاز بناتا ہے۔اپنے عہد کے مجموعی انتشار اور مختلف نظریات اور فلسفوں کی یلغار کے باوجود میراجی کی شخصیت میں ایک روایتی عنصر بھی موجود تھا۔ یہ عنصر ایک ایسی باطنی یا روحانی تنہائی ہے جس کے ڈانڈے صوفیانہ دردوغم سے جاملتے ہیں۔ یہ ایک ایسا رویہ ہے جو انسان کو اپنے آس پاس کی الجھنوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔'' یہ حقیقت ہے کہ میراجی بیسویں صدی کے اردو ادب میں ایک اہم اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری خصوصاً

نظموں کے ذریعہ جدید اردو کی بنیاد رکھی اور اپنی تنقید کے توسط سے اردو شاعری کی تفہیم کی اور نئے تنقیدی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ان کا کام ان کی عظمت کی سند ہے کہ میراجی اپنے عہد ہی میں نہیں آج بھی ایک اہم ادبی شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔''ڈاکٹر رشید امجد نے اپنے مقالہ میں تخلیق کے تمام تقاضے پورے کرنے کے ساتھ اپنی تخلیقی اور تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے میراجی کی ادبی حیثیت پر دستاویزی نوعیت کا اہم اور یادگار کام کر دیا ہے۔اس کتاب (مقالہ) کا مطالعہ کر تے ہوئے میں نے میراجی سے بھر پور ملاقات کی ہے۔میراجی کی شاعری اور ان کے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے حیدر قریشی اور رشید امجد نے اس نقطہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جہاں ایک طرف میراجی نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور جدید شاعری کے تقاضوں سے اردو شاعری سے ہمکنار کیا۔وہیں دوسری طرف اپنے فن کو سند دلانے کے لیے روایتی شاعری کے اسرار و رموز سے استفادات کرتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے اردو شاعری میں میراجی نے ایک منفرد مقام حاصل کیا اور قدیم و جدید شاعری کے دھاروں کو ملا دیا۔

میراجی کی تخلیقات کے مطالعے کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ہندو یا مسلمان ہونا افضل نہیں ہے۔بلکہ ایک انسان کا انسان ہونا افصل ہے۔موصوف کی تخلیقات میں انسانی رشتوں کی عظمت کا خوبصورت بیان ملتا ہے جس میں' انسانیت شرافت' مذہبی' قومی اور نسلی اتحاد کی ایسی تصویریں نظر آتی ہیں جو ہمیں امید، اعتماد اور حوصلہ عطا کرتی ہیں۔قومی یکجہتی اور انسانی رشتوں کے حوالے سے میراجی کا عقیدہ ہے کہ یہ دنیا مختلف قوموں، نسلوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے اس کی تعمیر میں عہد بہ عہد زمانے کے ساتھ ساتھ ہر قوم نے اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہزاروں نشانیاں ایسی ہیں جو انسانوں کی مشترکہ تہذیب کی دلیل ہیں۔پورا عالم سیکولر ہے اور اس کے سیکولر مزاج اور اقدار کو برقرار رکھنا ہر قوم، ہر مذہب اور ہر زبان کا فرض ہے۔اسی لیے بین الاقوامی سطح پر سمینار کرنا، کتابیں لکھنا، رسائل و جرائد کی اشاعت کرنا اور علمی و ادبی مذاکرے منعقد کرانا ہم سب کا اولین فریضہ ہے۔ڈاکٹر وحید قریشی اس میدان کارزار کے

سالارِ قافلہ ہیں۔ اگر عالمی سطح پر اخوت ومحبت اور امن امان کو برقرار رکھنا اور مزید قوت بخشنا ہے تو ہر قوم اور ہر مذہب والوں کو اس سلسلہ میں پیش رفت کرنی ہوگی۔ تبھی ہم کہہ سکیں گے کہ یہ دنیا خوبصورت ہے۔ زمانے سے اردو ادب جمود وتعطل کا شکار تھی۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس پر عہد کے ایک غیر ادبی تحریک کے اثرات مرتسم ہو چکے تھے۔ عقلِ انسانی اپنی تمام تر جدت ترازیوں کے باوجود خرد کی منزلوں سے کافی دور فلسفیانہ موشگافیوں میں مشغول تھی ادبی جلسوں، ترسیل وابلاغ کے سلسلہ میں ختم ہو چکے تھے۔ رشد وہدایت کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ ضلالت وگمراہی اور خود پرستی وادبی اور خدا ناشناسی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی تھی۔ چرخ نیلی فام سے ناگاہ 1912 میں موجودہ پاکستان کے ایک شہر گوجرانوالہ میں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا دعائے خلیل اور نوید مسیحا ظاہر ہوئی خدا نے اردو ادب کو از سر نو جلا بخشنے کے لیے میرا جی کو محدود مدت کے لیے اس سرزمین پر وارد کیا تاکہ انسانیت کی کھیتی سرسبز اور شاداب ہو اور اردو ادب کی دبستاں بہ آور ہو۔ انسانی جاگیرداری اور ادبی اجارہ داری کے ظلم وستم سے عوام الناس کی زندگی پاک ہو سکے۔ بہر حال میرا جی 1912 میں پیدا ہوئے آپ کی زندگی دنیا کی اس خطہ میں گزری جسے فردوس بلکہ خوابوں کی سرزمین سے تعبیر کیا جاتا ہے یہ جگہ نہ صرف اپنی جمال ورعنائی کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور اور مصروف ہے بلکہ علمی وادبی ثقافتی اعتبار سے اس کا اپنا ایک شاندار ماضی یا کہیے تاریخ بھی ہے اس شہر کا ظاہری نقش ونگار اتنے دل رہا۔ دل پذیر اور دل آویز ہیں کہ ایک بار نگاہوں میں بس جائیں تو دل کی گہرائیوں میں سما جائیں ماضی بھی تاریخی اعتبار سے ارفع واعلیٰ ہے کہ ایک بار اس کے ماضی میں جھانک کر دیکھیں تو نگاہ دل کی گہرائیوں میں تجلیاں بکھیر دے اس جنت ارض کی تاریخ کو صدیوں پر محیط مورخوں نے رقم کیا ہے جو کہ آج کل بھی نہ معلوم دنیا کی کتنی لائبریوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ جس سے کروڑوں انسان استفادہ کر کے اپنی علمی تشنگی کو بجھاتے ہیں۔ میرا جی نے اپنی شاعری کے ذریعہ تعلیمی اور ادبی میدان میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں ان کی مقبولیت عام ہے ویسے تو دیگر شعراء اور

ادیبوں کی طرح ہر سال مراجی کی بھی یوم وفات اور یوم پیدائش کے تقریبات کا اہتمام کیا جاتا ہے اوراس سال 2012 کو موصوف کو صدی پیدائش کا شرف حاصل ہے اس ضمن میں دنیا بھر میں میرا جی کی صدی (Cenatury) اسی تزک واحتشام سے منایا جارہا ہے۔ جس ذوق وشوق کے ساتھ سال گزشتہ فیض احمد فیض (Cenatury) منائی گئی ہے۔ ہندو پاک کو آزاد ہوئے چھ دہائی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اب بھی برصغیر ہندو پاک کے مسلمانوں کی حالت ابتر بنی ہوئی ہے۔ ایسا کیوں؟ برصغیر ہندو پاک آزاد ہوگئے مگر برصغیر ہندو پاک کے خطہ افلاس سے نیچے زندگی گزارنے والے مسلمانوں کے حالات نہیں بدلے۔ میراجی نے اپنی تخلیقات کے ذریعہ اس دبی کچلی اور ظلم وستم زدہ عوام الناس کے مسائل کو بروئے کار لانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ موصوف کی تحریریں ادب برائے زندگی کا حقیقت اور مستحکم تعریف مرتب کرتی ہیں۔ جس کا کوئی ثانی نہیں۔ بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کی تعلیمی معاشی اور سماجی صورت حال پر جو تبصرے اور رپورٹ پیش کیے جارہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی بروقت حقیقی تصویر ہے۔ لہٰذا عالم کاری کے اس دور اور عصری تقاضے کی روشنی میں اردو ادب کو استحکام بخشنے کے لیے ضرورت ہے کہ ہم میراجی کی تحریک کو سمجھنا چاہیے۔ اور اسے آگے بڑھانے میں بھرپور محنت کرنی چاہیے۔ میراجی شناسی میں حیدر قریشی ''جدید ادب کا میراجی نمبر جونسخہ سنیما پیش کرنے جارہے ہیں۔ ان کی مثال مفقود ہے۔ موصوف کی ان خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا یہ صرف ایک جنرل نہیں بلکہ یہ ایک عظیم الشان تعلیمی اور ادبی مشن ہے۔

میراجی کے کارنامے اور حلقہ ارباب ذوق کے حوالے سے پروفیسر انور سدید تحریر کر تے ہیں کہ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کو بالعموم ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جا تا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ داخلیت اور خارجیت، مادیت، اور روحانیت مستقیم ابلاغ اور غیر مستقیم ابلاغ کی بنا پر ان دونوں تحریکوں میں واضح حدود اختلاف موجود ہیں۔ تاہم یہ دونوں تحریکیں قریباً ایک ہی زمانے میں ایک جیسے سماجی اور معاشی حالات میں پیدا ہوئیں، پروان

چڑھیں اور معنوی طور پر رومانیت کے بطن سے ہی پھوٹی تھیں۔ حقیقت نگاری سے امتزاج کی بنا پر ترقی پسند تحریک نے افقی جہت اختیار کی اور اجتماعی عمل کو مادی سطح پر بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ حلقہ ارباب ذوق نے عمودی جہت اختیار کی اور اس نے اجتماع میں گم ہو جانے کے بجائے ابن آدم کو اپنی شخصیت کے عرفان کی طرف متوجہ کیا۔ ایک تحریک کا عمل بلاواسطہ خارجی اور ہنگامی تھا اور دوسری تحریک کا عمل بالواسطہ، داخلی اور آہستہ رو، چنانچہ ان دونوں تحریکوں نے نہ صرف اپنے عہد کے ادب کو متاثر کیا بلکہ دو الگ الگ اسلوب حیات بھی پیدا کیے۔ ترقی پسند تحریک نے مادی وسائل پر فتح حاصل کرنے کی سعی کی جبکہ حلقہ ارباب ذوق نے مادیت سے گریز اختیار کر کے روحانیت اور داخلیت کو فروغ دیا۔

میراجی اس تحریک کے روح رواں تھے اور ادباء اور شعراء کا یہ فرض سمجھتے تھے کہ اس کے اندرون اور اس کی ذات کے تجربات خارجی عوامل کی روشن میں پیش کیے جائیں کہ سماجی مسائل کو پیش کرنے میں خود ادیب کا اپنا وجود ختم ہو جائے۔ چونکہ میراجی اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ تو غیر منقسم ہندوستان میں گزارا ہے اور وہ حلقہ ارباب یا مجلس داستاں گویاں کے اہم ستون ہیں۔ اس لیے ہندو پاک یکساں طور پر مقبول رہے۔ برصغیر ہندو پاک میں منٹو، فیض اور رویندر ناتھ ٹیگور کے بعد میراجی کو ہی عالمی شاعر ہونے کا مقام اور مرتبہ حاصل ہے۔ ان کی تمام زندگی جدوجہد میں گزری اور وہ ہمیشہ سماجی کے لیے صدا بلند کرتے رہے۔ جب جب آپ میراجی کو پڑھیں ہر بار ان کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے گا۔ اور ان کی شاعری کی متعدد پرتیں کھلتی ہوئی نظر آئیں گی اور ذہنی ماحول کے مطابق ان کے کلام کے رنگ و معنی ہر بار بدلتے نظر آتے ہیں۔ آج پورے عالم میں میراجی کا صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ میراجی پوری اردو دنیا کے درمیان ایک پل کے مانند کھڑے ہیں۔ میراجی جیسے شاعر کسی ایک ملک کے لیے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لیے ہوتے ہیں۔ میراجی کے کلام کو مختلف زبانوں میں بھی شائع کیا جانا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پڑھنے کا موقع مل سکے۔ میراجی کلام ک روشنی میں ہماری خواہش ہے کہ دونوں

ملکوں کی مزگیاں ہی نہیں پوری دنیا کے لوگ پیار و محبت کی ڈور سے خود کو جوڑ لیں۔

میرا جی ہمہ جہت شخصیت کے مالک، ایک بہترین مقرر، مصنف، صحافی، سماجی مصلح اوران سے سب سے بڑھ کر وہ ایک عظیم انسان تھے۔ المیہ یہ ہے کہ موصوف کے تعلق سے ان کے عہد سے ہی کچھ لوگوں کے اندر کچھ غلط فہمیاں رہی ہیں ضرورت ہے کہ لوگ ان سے خود کو پاک کرلیں آج سے سو سال پہلے جب میرا جی نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس وقت ہندو پاک پر حکومت برطانیہ کا تسلط تھا ہندوستان آزادی کی لڑائی میں سرگرداں تھا۔ اس دوران برصغیر کے جملہ طبقات اور سرکاری غیر سرکاری محکمات میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی ایسے میں اردو ادب بھی حالات کے پیش نظر تغیر و تبدیلی کے نشیب و فراز سے دوچار رہا ہے۔ ایسے وقت میں ایک واحد تحریک نے اردو ادب کو فروغ اور استحکام بخشا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے اور جس تحریک کا روح رواں میرا جی تھا۔ عالمی سطح پر میرا جی نے جو عظیم ادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ہمیں اس کی قدر کرنا چاہیے۔ اوران کے اس مشن کو فروغ دینا چاہیے۔ بین الاقوامی سطح پر اس سلسلہ میں بالخصوص مسلم اور بالعموم انسانی قیادت کو آگے آنا چاہیے۔ میرا جی کی تخلیقات کی روشنی میں انسانوں پر ہو رہے ظلم و ناانصافی کے خلاف اپنی آواز بلند کرنی چاہیے اور لڑائی لڑنی چاہیے۔ دیگر عالمی برادری کے مقابلے میں ہم کافی پیچھے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اپنی اس پسماندگی کی ذمہ داری دوسروں کے سر ڈال دیتے ہیں جبکہ ہمیں خود محاسبہ کرنا چاہیے۔ آج جب عالمی برادری ہماری مدد کے لیے سامنے آتی ہے تو ہماری ملت کے افراد ہی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ یہ اچھا نہیں ہے میرا جی کی یہ صدی ہمیں نہایت احترام سے منانا چاہیے اور تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ہمیں اتحاد اور یکجہتی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں میرا جی کے مشن کو آگے بڑھانے میں حیدر قریشی صاحب کے مرتب کردہ جدید ادب میرا جی نمبر کلیدی رول ادا کرے گا۔

میرا جی کے حوالے سے پروفیسر انور سدید اپنی معرکۃ الآرا کتاب اردو ادب کی تحریکیں ابتدا تا 1975ء مطبع کتابی دنیا دہلی کے صفحہ نمبر 541 تا 545 یوں رقم طراز ہیں۔ حلقہ ارباب

ذوق کو میراجی کی ذات میں وہ شخصیت میسر آ گئی جو بکھرے ہوئے اجزا کو مجتمع کرنے اورانہیں ایک مخصوص جہت میں گامزن کرنے کا سلیقہ رکھتی تھی۔ میراجی ذہنی اعتبار سے مغرب کے جدید علوم کی طرف راغب تھے لیکن ان کی فکری جڑیں قدیم ہندوستان میں پیوست تھیں۔مشرق اور مغرب کے اس دلچسپ امتزاج نے ان کی شخصیت کے گرد ایک پراسرار جال سا بن دیا تھا۔ چنانچہ ان کے قریب آنے والا ان کے سحر مطالعہ میں گرفتار ہوجاتا اور پھر ساری عمر اس سے نکلنے کی راہ نہ پا تا۔ دور سے دیکھنے والے ان کی ظاہری ہیئت کذائی، بے ترتیبی اور آزادہ روی پر حیرت زدہ ہوتے اور پھر ہمیشہ حیرت زدہ رہتے۔ میراجی کی عظمت کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ وہ حلقے کے ارکان میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑے تھے۔ان کا ادبی ذوق پختہ اور مطالعہ وسیع تھا اور حلقے میں آنے سے پہلے وہ والٹ وٹمن ، بودلیئر، میلارمے، لارنس، چنڈی داس، ودیاپتی اورامارو وغیرہ کے مطالعے کے بعد ان شعراء پر تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کر چکے تھے۔ان میں میراجی کا ادبی رشتہ مولانا صلاح الدین احمد سے استوار ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے ربع چہارم میں ''ادبی دنیا'' تجدد کا ایک ایسا آفتاب تھا جس نے مشرقی اور مغربی ادب کی روشن کرنوں کو حلقے کی تحریک سے بہت پہلے اکناف ہند میں پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ ادبی دنیا میں منصور احمد، حامد علی خاں، جلیل قدوائی، خلیل بی اے۔ سراج الدین احمد نظامی وغیرہ نے مغربی ادب کے تراجم کا عمدہ سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ان کے ساتھ اختر شیرانی، حفیظ ہوشیار پوری اور شاد عارفی وغیرہ کی نظمیں اور غزلیں بھی شائع ہوتی تھیں۔ چنانچہ ادبی دنیا ایک ایسا سنگم تھا جہاں قدیم اور جدید ادب کے دونوں دھارے باہم مل جاتے تھے۔ ادبی دنیا چونکہ کسی نظریاتی جکڑ بندی کو قبول نہیں کرتا تھا۔اس لیے اس نے خالص ادب کی اشاعت کی ،اور نئے ادبا کو متعارف کرانے میں خصوصی دلچسپی لی۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ ادبی دنیا کی آزاد روش نے ہی میراجی کو اس رسالے کی طرف متوجہ کیا اور پھر مدیر مولانا صلاح الدین احمد اور ادیب میراجی کے درمیان جو رشتہ قائم ہوا اس میں چونکہ خلوص اور ایثار قدر مشترک کے طور پر

موجود تھے۔اس لیے یہ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔1939 میں جب میراجی ادبی دنیا کے مدیر معاون مقرر ہوئے تو ہیئت، خیال اور موضوع کے وہ تمام تجربات جنہیں مریاجی کے ذہن نے پیدا کیا تھا ''ادبی دنیا'' کے صفحات میں بکھر گئے۔ چنانچہ جب حلقہ ارباب ذوق کی ابتدا ہوئی تو میراجی ادبی تربیت کا دور نہ صرف ختم کر چکے تھے بلکہ وہ ادب میں شہرت اور ناموری بھی حاصل کر چکے تھے اور ادبی دنیا کے ساتھ وابستگی کی بنا پر انہیں اہمیت بھی حاصل تھی۔ میراجی کی شمولیت کے بعد حلقہ ارباب ذوق نے نہ صرف اجتہاد اور ترقی کی طرف قدم بڑھایا بلکہ اس نے ترقی پسند تحریک کی مقصدیت کے خلاف ردعمل بھی ظاہر کیا اور اس کی یکسانیت کے مقابلے میں تنوع پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ حلقے نے اب ایک ایسی تحریک کی صورت اختیار کر لی جو ادب کی موجود حالت کو بدلنے اور فن کے داخلی حسن کو اجاگر کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ حلقے کی زندگی کے گزشتہ چند عشروں پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے تو خالص ادب کی یہ تحریک بے حد فعال اور توانا نظر آتی ہے۔اس میں جزرومد، عمل اور ردعمل اور بحث و نظر کی گہما گہمی پیدا ہوئی یوں اس تحریک نے اولین سطح پر زندگی سے اثرات قبول کیے اور انہیں ادب کی بنت میں شامل کیا اور ثانوی سطح پر زندگی کو بالواسطہ طور پر متاثر کرنے کی کوشش کی۔ میراجی کے حوالے سے جن چند دانشوروں کی تحریر میں منظر عام پر آئی ہیں ان میں کمار پاشی اہم نام ہیں۔

اردو ادب کی عبقری شخصیت کمار پاشی نے ''میراجی شخصیت اور فن'' کے نام سے کتاب مرتب کی ہے۔ کتاب کے شروع میں ہی موصوف مضمون بعنوان'' ہندوستان کی تہذیبی اقدار کا محافظ میراجی'' کے حوالے سے لکھتے ہیں۔''لب جوئبارے میراجی کی بدنام ترین نظم ہے۔عام خیال ہے کہ میراجی نے یہ نظم ماسٹر پنشن پر لکھی ہے۔صرف یہی ایک نظم نہیں بلکہ میراجی کی پوری شاعری کو جنسی غلاظت کو ڈھیر قرار دے کر ترقی پسندوں نے اسے ادب سے باہر کرنے کی پوری پوری کوشش کی مگر میراجی کی شاعری میں چونکہ زندگی کی رمق و چمک موجود تھی اس لیے وہ آج یعنی اپنی موت کے تقریباً تیس برس بعد پہلے سے زیادہ دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے اور نئے شعرا کا محبوب

ترین شاعر ہے۔اس بیان سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ میراجی سماجی مسائل پر توجہ نہیں دیتے بلکہ وہ بہتر ڈھنگ سے ادبی تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے پیش کرتے ہیں اور قدیم روایات سے اپنے رشتے کو بھی استوار رکھتے ہیں۔

میراجی کی نظمیں کے دیباچے میں خود میراجی نے لکھا ہے کہ ''ماضی کے رنگ حل کی کنجی ہماری ذات کے بہت سے مسائل کو سلجھا سکتی ہے۔اس سے انکار نہیں ہوسکتا ہے اس لیے اپنی شخصیت کی نشوونما کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں بھی ماضی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ ''میراجی کے اس غیر مبہم بیان کی روشنی میں اگر ہم لب جوئبارے کا مطالعہ کریں تو مختلف نتائج سامنے آتے ہیں۔دراصل یہ نظم منشیہ اور پراکرتی کے ازلی رشتے کی ایک پرانی اور دوردناک داستان ہے۔مذکورہ بیان سے میراجی مسائل کے حل کے لیے ماضی کی طرف پلٹنا اور اس سے سبق حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں پھر اس کو شاعر کی ذات سے ہم آہنگ کر کے مسائل کی پرکھ اور اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔میراجی کی زندگی میں ذاتیات اور اس سے بڑھ کر جنسیات کی آمیزش کو اس ان کی زندگی سے الگ کر کے دیکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ن،م، راشد کے اس مندرجہ ذیل بیان کی روشنی میں اس الزام تراشی کا ازالہ ہوجائے گا۔ن،م، راشد کی رائے میں میراجی کا مقصد کبھی سفلی جذبات کو اکسانا نہ تھا بلکہ جہاں کہیں جنس کا ذکر کرتے ہیں۔کبھی بلند بانگ طریقے سے نہیں کرتے۔(جوش کی شاعری ملاحظہ فرمائیے)لذت انگیز صورت پارے بھی آنکھوں کے سامنے نہیں لاتے۔(جیسے فیض کے ہاں ملتے ہیں)اس لیے یہ الزام لگانا کہ وہ بیمار ذہن کے مالک تھے جس پر جنسیت کا غلبہ تھا یا عمداً فحاشی کی تبلیغ کرتے تھے۔لوگوں کی آراء شرارت کے مترادف ہے''۔(بحوالہ میراجی شخصیت وفن از کمار پاشی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

ن م راشد کے مطابق اگر میراجی کی نظموں کو فحاشی پر محمول کیا جاے تو جوش وفیض بھی اس الزام کے دائرے میں آجائیں گے جبکہ ایسا نہیں ہے یہ الزام محض ناسمجھی پر محمول ہے۔اس رائے نے میراجی کی تحریروں میں اور زور پیدا کر دیا اور فکر وخیال میں مزید پختگی کا احساس ہوتا

ہے۔خود میراجی اپنی نظموں کے حوالے سے لکھتے ہیں۔''بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ محض جنسی پہلو ہی میری توجہ کا واحد مرکز ہے۔لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔جنسی تعلق اوراس کے متعلقات کو میں قدرت کی سب سے بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب وتمدن نے جمع کر رکھی ہے۔وہ مجھے ناگوار گزرتی ہےاس لیے ردعمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہےاور جو میرا آدرش ہے''۔وزیر آغا میراجی پر اپنے مضمون میں اظہار خیال کرتے ہیں۔

غیر ملکی حکومت کے استبداد کے خلاف جو ردعمل وجود میں آیا،اس کا ایک نمایاں پس منظر وطن دوستی کے میلان کی صورت میں ہمارے پیش نظر ہے۔گویا یہ ردعمل ملکی غلبے اور مغربی تہذیب کے نفوذ کے خلاف اہل وطن کی وہ سعی ہے جسے نفسیات کی اصطلاح میں تحفظ ذات کا نام دینا چاہیے۔چانچہ اس کے تحت بہت سے نظم گو شعراء نے حب الوطنی کے جذبات کا اظہار کیا۔محروم،اقبال اور راشد کے ہاں بالخصوص یہ رجحان بہت قوی تھا۔تاہم یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ رجحان دراصل غیر ملکی سیاسی اور تہذیبی دباؤ کے خلاف ردعمل کی ایک صورت تھی۔ارض وطن سے کسی مثبت شغف اور لگاؤ سے اس کو تحریک نہیں ملتی تھی اوران شعرا کے ہاں اس رجحان کی جڑیں ہی مضبوط تھیں۔ چنانچہ خود اقبال جو شروع شروع میں وطن دوستی کے ایک بہت برے علمبر دار تھے،جب نظر ثانی تصادم میں مبتلا ہوئے تو وطن دوستی کی بجائے ملت پرستی کی طرف مائل ہو گئے اوران کے ہاں ہمالہ،جنگل اور کٹیا کی بجائے صحراء کارواں اور خیمے (یعنی خالص اسلامی تہذیب کی) علامتیں ابھرتی چلی آئیں۔اسی مضمون میں آگے چل کر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ اردو نظم میں میراجی وہ پہلا شاعر ہے جس نے محض رسمی طور پر ملکی رسوم عقائد اور مظاہر سے وابستگی کا اظہار نہیں کیا اور نہ مغربی تہذیب سے ردعمل کے طور پر اپنے وطن کے گن گائے ہیں بلکہ جس کی روح دھرتی کی روح سے ہم آہنگ اور جس کا سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز قدیم ملی روایات،تاریخ اور اساطیر سے مملو ہے۔

وزیر آغا نے اپنے مضمون کے ذریعہ میرا جی کی وطن دوستی اور اس کے تاریخی اور تہذیبی سروکار سے جو لگاؤ رہا ہے اس کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اپنی سرزمین اور اس کی سوندھی مٹی سے میرا جی کو جو انسیت تھی وہ تا عمر باقی رہی۔ اور انہوں نے دوسرے شعرا کی طرح غیر ملکی تہذیب کی مخالفت کے بجائے اپنی تہذیب اور ملی اقدار کی پاسداری کو ترجیح دی۔ اور دیگر شعرا کی طرح کبھی اس احساس کو ماند نہیں پڑنے دیا کہ ان کا جسم اور روح مشرقی تہذیب و تمدن سے پیدا ہوئی۔ ایک عظیم ادیب دانشور اخلاق احمد دہلوی نے ان کی زندگی سے متعلق جو محسوس کیا اس کو کچھ یوں قلمبند کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات میرا جی کی حوالے سے ملاحظہ فرمائیں:

> ''جب میرا جی اپنی دانست میں سمجھ لیتے کہ تخلیہ ہو گیا تو اپنے گلے کی ہندوانی مالائیں گریبان سے باہر نکالتے اور ان مالاؤں کے ایک ایک دانے پر میرا میرا پڑھتے اور بالکل اس آسن میں ہو بیٹھتے ،جس طرح سادھو گیان دھیان میں بیٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی میرا کے بھجن بھی گاتے تھے۔ ان کا مطالعہ مذہبیات، جنسیات، اور نفسیات پر بے پناہ تھا۔ ہندو مائی تھولوجی سے انہیں خاص شغف تھا شاید اس لیے کہ ان کی محبوبہ ''کافر'' تھی۔ میرا جی خود لاڈ میں کبھی کبھی میرا سین کو ''کافر'' کہا کرتے تھے۔''

میرا جی کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کا تصوف سے لگاؤ اور حد درجہ وابستگی کا تھا۔ اخلاق احمد دہلوی نے بڑے موثر انداز میں میرا جی کی مذہبیات، جنسیات اور نفسیات کی آمیزش کے ذریعہ ان کی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش ہے۔ میرا جی اپنی ذاتی زندگی میں جن نفسیاتی مراحل سے گزرے ہیں اس کے اظہار کے لیے انہوں نے مذہبی، تھولیوجی کا استعمال کیا ہے جو کہ ان کے ہم عصر شعراء کے یہاں خال خال نظر آتا ہے۔ مبصر نے اس نقطے کی طرف اشارے کر کے میرا جی

کی شاعری کے بڑے ہی اہم گوشے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میراجی کو صرف جنس پرست کہہ کر گزر انہیں جا سکتا بلکہ ان کی ذاتی زندگی کا مطالعہ بے حد ضروری ہے تاکہ ان کی شاعری کو سمجھا جا سکے۔ کیونکہ ذاتی زندگی کے وہ گوشے جنہوں نے میراجی کو میراجی بنایا نہایت ضروری ہے۔ شاہد احمد دہلوی کی مندرجہ ذیل اقتباسات میراجی کی حوالے سے ملاحظہ فرمائیں۔

میراجی کو طرح طرح کے غم رہتے تھے۔ جب وہ ادبی دنیا میں نائب مدیر تھے تو انہیں تنخواہ تیس روپے ملتی تھی وہ اسی سے شراب بھی پیتے اور اپنے جھوٹے موٹے خرچ بھی پورے کرتے۔ ماں باپ اور بھائیوں کے ساتھ رہتے تھے اس تنگ دستی سے افسردہ رہتے تھے۔ آدمی حساس تھے۔ بھائیوں کی تعلیم کے لیے بے قرار رہتے تھے مگر ان کے لیے کوئی وسیلہ نہ نکال سکتے تھے۔ اپنی ماں پر انہیں بڑا ترس آتا تھا۔ ان کی ماں ان کے باپ کی دوسری بیوی تھیں۔ عمروں میں تفاوت کچھ زیادہ ہی تھی۔ میراجی سمجھتے تھے کہ ماں کی جوانی بوڑھے باپ کے ساتھ اکارت گئی۔ باپ کو وہ ظالم اور ماں کو مظلوم سمجھتے تھے۔ مگر باپ کے ساتھ کوئی گستاخی انہوں نے کبھی نہیں کی۔ بلکہ باپ سے انہیں محبت ہی تھی۔ جبھی تو انہیں جب پونے میں اپنے اندھے باپ کے مرنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے مسجد میں جا کر منبر کے پاس پیشاب کیا اور کہا ''تو نے میرے باپ کو مار دیا، اس لیے میں تیرے گھر میں پیشاب کرتا ہوں''۔

میراجی کے سلسلہ میں شاہد احمد دہلوی ایک جگہ لکھتے ہیں۔ میراجی کے عزیز دوست یوسف ظفر نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ وہ اس سال حج کو گئے تھے، فرماتے تھے کہ میں مدینہ منورہ میں حضور کی جالیوں سے کچھ فاصلہ پر بیٹھا مراقبے میں غرق تھا اور جو مجھے یاد آتا رہا میں اس کے لیے دعا کرتا رہا، یہاں تک کہ کوئی نام باقی نہ رہا۔ مجھ پر عجیب سرور کا عالم طاری تھا۔ قلب گداز ہو گیا تھا اور آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں بندھی ہوئی تھیں کہ یکا یک میراجی میرے سامنے آ کھڑے ہوئے اور بولے ''مجھے بھول گئے، میرے لیے تم نے دعا نہیں کی۔'' میں نے اسی وقت میراجی کے لیے بھی دعا کی۔ وہ سامنے کھڑے رہے۔ دعا ختم کر کے جو دیکھتا ہوں تو نہ میراجی ہیں نہ کوئی اور

بس میں تھا اور میرے سامنے حضور کی جالیاں تھیں۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ اس قدر گندہ اور ناپاک شخص بھلا ایسی پاکیزہ اور مقدس جگہ کیسے آ گیا؟ دنوں میں اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ پھر ایک دم سے ایک دن میراجی سے اپنی پہلی ملاقات یاد آ گئی۔ یہ اس رات کا واقعہ ہے کہ جب وہ بیئر کی اٹھارہ بوتلیں پی کر میرے گھر میں آدھی رات کو درانہ چلے آئے تھے۔ میں نے ان سے ان کا نام پوچھا تھا تو انھوں نے اپنا نام میراجی بتایا تھا کہ اور جب میں نے ان سے ان کا اصلی نام دریافت کیا تو انھوں نے اپنی تیوری پر بل ڈال کر کہا تھا: ''میرا اصلی نام محمد ثناء اللہ ڈار ہے۔ اس نام میں ''محمد'' کا لفظ آتا ہے۔ کسی کو حق نہیں ہے کہ اپنے گندے منہ سے اس پاک لفظ کو ادا کرے۔'' کڑی سے کڑی مل گئی تھی اور میری چٹیک دور ہوگئی تھی مجھے یقین ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس والہانہ احترام کے صلے میں میراجی کی بخشش ہوگئی ہوگی اور حضور کی اس بے اندازہ محبت کے طفیل میراجی کے سارے گناہ معاف ہوگئے ہوں گے۔ (بحوالہ میراجی شخصیت وفن از کمار پاشی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی)

شاہد احمد دہلوی میراجی کے سلسلہ میں جس جذباتی عقیدت و احترام کا اظہار کرتے ہیں ان کی اس بات سے میراجی کی عزت اور مقام و مرتبہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالانکہ جن خواب کا ذکر شاہد احمد دہلوی نے کیا اس سے اس مرئی اور حقیقی زندگی میراجی کے سلسلہ میں ان کی ذاتی عقیدت ہوسکتی ہے۔ لیکن اتنا تو طے ہے کہ یہ میں عزت ان کی نظر میں یوں ہی نہیں پیدا ہوئی ہے۔ ان کی تحریریں خیالات اور اردو شعر و ادب میں جو تجربے ہوئے ان کے حوالے سے میراجی کی شخصیت اس بات کی متقاضی ہے جو مقام و مرتبہ شاہد احمد دہلوی نے انہیں دیا۔ ایک عظیم تنقید نگار سعادت حسن منٹو کے مطابق:۔

میراجی کی لکھائی بہت صاف اور واضح تھی۔ موٹے خط کے نب سے نکلے ہوئے بڑے صحیح نشست کے حروف، تکون کی سی آسانی بنے ہوئے ہر جوڑ نمایاں میں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے اس میں مولانا حامد علی خاں مدیر ''ہمایوں'' کی خطاطی کی جھلک نظر

آئی۔ یہ ہلکی سی مگر کافی مرئی مماثلت ومشابہت اپنے اندر کیا گہرائی رکھتی ہے۔اس کے متعلق میں اب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا کوئی شوشہ یا نکتہ سمجھائی نہیں دیتا جس پر میں کسی مفروضے کی بنیادیں کھڑی کرسکوں۔۔۔بحیثیت شاعر کے اس کی حیثیت رہی ہے جو گلے سڑے پتوں کی ہوتی ہے جسے کھاد کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔میں سمجھتا ہوں اس کا کلام بڑی عمدہ کھاد ہے جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہوکے رہے گی۔اس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کلام ہے جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لیے اونچی فضاؤں میں مرغ بادنما کا کام دے سکتا ہے۔اسی کا کلام ایک ''جگ سا پزل'' ہے جس کے ٹکڑے بڑے اطمینان اور سکون سے جوڑ کر دیکھنے چاہئیں۔

میراجی کی شخصیت اوران کی ذات کا جو پہلو تھا وہ بھی ان کی شاعری کی طرح انوکھا تھا منٹو لکھتے ہیں:

بحیثیت انسان کے وہ بڑا دلچسپ تھا۔پرلے درجے کا مخلص جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔میرا ذاتی خیال ہے کہ اشخاص جو اپنی خواہشات جسمانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں عام طور پر اسی قسم کے مخلص ہوتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں مگر اس فریب دہی میں جو خلوص ہوتا ہے۔وہ ظاہر ہے۔میراجی نے شاعری کی، بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی، بڑے خلوص کے ساتھ بھنگ پی،وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ لوگوں سے دوستی کی،اور اسے نبھایا۔اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کی جُل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکا فریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔اس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اس قدر بےضرر ہوگیا تھا کہ بےمصرف سا معلوم ہوتا تھا ایک بھٹکا ہوا مسافر جو نگری نگری پھر رہا ہے۔منزلیں قدم قدم پر اپنی آغوش اس کے لیے وا کرتی ہیں۔مگر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جارہا ہے۔کسی ایسی جگہ جس کی کوئی سمت ہے رقبہ۔۔۔ایک ایسی تکون کی جانب سے جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل میں اس کے گرد گھوم

رہے ہیں۔میراجی صرف اپنے اسلوب تحریر میں ہی منفرد نہیں تھے بلکہ ان کی ذاتی زندگی کے انتشار کے برعکس ان کی خطاطی اسلوب تحریر کی طرح نہایت صاف اور واضح تھی۔منظم حروف کی نشست و برخاست بہت متاثر کن تھا۔اس بات کا اظہار سعادت حسن منٹو نے اپنے مضمون'' تین گولے'' میں کیا ہے۔اور خط کو مولانا حامد علی خاں جو کہ جریدہ 'ہمایوں' کے مدیر تھے سے مشابہ قرار دیا ہے۔ لیکن وہیں اس مشابہت پر حیرت زدہ بھی ہیں اور وجہ تلاش کرتے ہیں لیکن نتیجہ سے مایوسی ہوتی ہے۔میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وجہ تلاش کی جائے کہ دو بڑے فنکاروں کا خط یکساں کیوں ہے۔منٹو میراجی کے مداحوں میں سے ہیں ان کے مطابق میراجی کی شاعری کو عریاں یا فرسودہ کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا بلکہ اس کی شاعری میں انسانی جذبات کی وہ پیچیدگیاں پنہاں ہیں جس سے آنے والی نسلیں مستفیض ہوں گی اور اپنی تخلیقات میں اسے برتیں گی۔میراجی نے خود تو اپنی ذاتی زندگی میں فراز کے مقابلہ نشیب کا اختیار کیا لیکن اپنے ہم عصروں اور بعد کی نسلوں کے لیے فراز اختیار کرکے اس کی سمت متعین کرگئے۔انسان کی ذاتی زندگی کے اثرات کا اس کے کلام پر پڑنا لازمی امر ہے۔میراجی کے ساتھ یہی ہوا۔عشق میں ناکامی کے بعد انہوں نے دوبارہ اس راہ میں ٹھہرنے کے بجائے ہمیشہ آگے کی طرف دھیان رکھا اور ہم عصروں کے لیے منزلوں کے دروازے وا کرتے چلے گئے۔جس کی وجہ سے میراجی کی زندگی اخلاص اور بردباری کا نمونہ بن گئی۔منٹو نے میراجی کی اس صفت کو بہت منصفانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

احمد بشیر کی مندرجہ ذیل اقتباسات میراجی کی حوالے سے ملاحظہ فرمائیں۔

'' وہ پان بہت کھاتا تھا۔دن میں اوسطاً چالیس پچاس اور یہ لت ایسی تھی کہ اس کے بغیر اس کا دن گزرنا مشکل تھا۔اس کے ساتھ گھومنے والے دو چار مرتبہ پان کھاتے تھے تو اسے بھی کھلا دیتے تھے مگر اس سے میراجی کی طلب پوری نہیں ہوتی تھی چنانچہ اس نے ایک پان والے ساتھی کو

یہ یقین دلایا کہ ممبئی کے پنواڑی پان بنانا نہیں جانتے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ پان کھانے والے ساتھی نے کودر لاج میں پاندان بنا لیا جس کے لیے چونا، کتھا اور چھالیاں میراجی خود لایا۔ اس کے بعد میراجی ہر روز صبح گھر سے نکلنے سے پہلے چالیس پانوں کی گڈی بنا کے بغل میں رکھ لیتا اور دن بھر چباتا رہتا۔ پان کے علاوہ میراجی دو وقت کھانا بھی کھاتا تھا اور چار ایک پیالے چائے بھی پیتا تھا۔ اس کے لیے میراجی کو کسی پلان کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جس کے ساتھ گھومتا تھا۔ وہ اسے از خود کھانا کھلا دیتا تھا یا یوں سمجھیے کہ میراجی گھومتا ہی اسی کے ساتھ تھا جو اسے خود منت کر کے کھانا کھلا دے اور وہ منت نہ بھی کرتا دعوت نہ بھی دیتا تو بھی کھانے میں شمولیت کرنے کے فن میں میراجی کی عظمت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا۔ کھانے پینے کی ضروریات پوری کرنے میں میراجی کا رویہ ایسے ہی نارمل قسم کے آدمی کا تھا جس کا مقصد دوسروں کی گرہ پر زندہ رہتا ہو۔ میراجی ایسے دوستوں کو بہت پسند کرتا تھا جو اسے روٹی کھلا دیتے تھے۔ مگر وہ کسی کا ممنون نہیں ہوتا تھا۔''

میراجی کی ذاتی زندگی کے سلسلہ میں میراجی پر لکھنے والوں نے خوب روشنی ڈالی ہے۔ احمد بشیر نے اس پہلو کی طرف خوش اسلوبی سے اشارہ کیا ہے جو کہ عموماً سماج میں ادنا سمجھا جاتا ہے۔ خورد و نوش سے متعلق میراجی اکثر دوسروں پر محمول رہتے، کھانے اور پینے میں وہ ذرہ برابر بھی شرمندگی نہیں کرتے بلکہ ان کی دوستی ایسے اشخاص سے ہوتی بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ ایسے اشخاص

سے دوستی کرتے جو کہ ان کو کھلائے اور پلائے۔ پان کثرت سے کھاتے لیکن اس کا انتظام خود نہ کرتے بلکہ کسی کے ساتھ ہو لیتے اور دیرینہ خواہش ہوتی کہ وہ ان کے کھانے پینے کی ضروریات پورا کرتا رہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ میراجی اس سلسلہ میں اپنے محسن کے ممنون نہ ہوتے یعنی اس خدمت کو وہ احبا کا فرض اور اپنا حق سمجھتے۔ اتنا کہنہ مشق اور حساس شاعر اگر ذاتی زندگی میں ایسی عادتوں کو اپنائے تو بجائے اس کی کمی کے اس کے آزادانہ مزاج اور طرز زندگی کا عکس سمجھنا چاہیے۔

مندرجہ ذیل میں میراجی خود اپنا مضمون نامکمل سیلف پورٹریٹ کے عنوان میں لکھتے ہیں اقتباس ملاحظ فرمائیں۔ لاہور میں مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ۔۔۔تینوں لحاظ سے زندگی میں وسعت پیدا ہوئی۔ تجربے اور مشاہدے پہلے شروع ہوئے اور مطالعہ بعد میں یہیں مخلوط تعلیم کی کمی نے میرے ذہن کو اس رستے کی طرف مائل کیا، جس کا ذکر اس سوانحی جائزے کے شروع میں ہے۔لیکن افسوس کہ یہ سفر محض ایک رومانی تجربہ بن کر ہی رہ گیا۔البتہ اسنے اس گہرے تجربے کے لیے زمین ہموار کردی۔ جس نے زندگی میں نہ صرف ایک مقصد پیدا کر دیا۔ بلکہ انسانی علم کے لحاظ سے بھی میری معلومات میں اضافہ کیا۔ظاہر ہے کہ یہ دوسرا تجربہ جنس مخالف سے تعلق رکھتا ہے۔مغرب میں شاید شیکسپیر کی بات سچ ہو کہ ''عورت تیرا نام کمزوری ہے۔لیکن مشرق کے حضوصاً ہندوستانی نوجوانوں کی موجودہ حالت دیکھتے ہوئے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ''عورت تیرا نام صدمہ ہے''۔ مادی لحاظ سے اس تجربہ کا تھا۔اس سلسلہ میں بچپن ہی سے دور کی چیزوں (پربت، دھند) سے جو رغبت لاشعور میں جاگزیں ہو چکی تھی اس نے اپنا کرشمہ دکھایا اور پھر اپنی حماقتوں اور آدرشی جبلت کی وجہ سے زندگی کا یہ پہلو یکسر تشنۂ تکمیل رہا، البتہ ذہنی نشوونما پر اس نے جو اثر چھوڑا، اس کی بہت سی علامتیں مجھے اپنی نظموں میں دکھائی دیتی ہیں۔ اس پہلو کے متعلق تفصیل سے فی الحال گریز چاہتا ہوں۔اس لیے اور کوئی بات نہیں کہتا۔ مشاہدے کے لحاظ سے اگرچہ بہ بحیثیت مجموعی زندگی کے ہر پہلو کی طرف میرے تجسس نے مجھے راغب کیا لیکن موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی، سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر

دیا ہے، بالخصوص میرا مرکز نظر رہا اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشان حالی کو جنسی رنگ دے دیا۔

میراجی کو لاہور کے قیام کے دوران جو تجربے حاصل ہوئے جیسا کہ خود انہوں نے اپنے ایک مضمون میں ''سیلف پورٹریٹ'' میں لکھا ہے کہ جو مشاہدے، مطالعے اور تجربے حاصل ہوئے۔ وہ تعلیمی اعتبار سے تو اہم تھے ہی لیکن ذاتی زندگی میں اس کا بہت بڑا اثر پڑا۔ ان کے مطابق اس تجربے سے زندگی میں کئی خواہشوں کی تکمیل نہیں ہوئی لیکن شاعری میں اس کا اثر ہوا اور علامتوں کے ذریعہ شاعری میں ظاہر ہوا۔ مشاہدے کا اثر بھی میراجی کی شاعری اور ان کے اسلوب پر پڑنا لازمی تھا۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی جبر و کشمکش کا نتیجہ تھا کہ میراجی کو اس مشاہدے میں جنسیات کے رنگ میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ اکثر شعراء کے گرد و پیش جو حالات رونما ہوتے ہیں۔ اس کا اثر ان کی نفسیات پر پڑتا ہے اور پھر اس کا اثر شاعری میں نظر آنا لازمی ہے۔ میراجی اس کا اظہار از خود کرتے ہیں۔ اور مختصر اس مضمون میں اپنے تمام پہلوؤں اور خطوط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جس پر انہوں نے اپنی سیدھی سادھی زندگی کو ڈال دیا تھا۔ میراجی کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے وہ فنی تقاضوں کو برتتے ہوئے رمز و کنایہ میں اپنی گفتگو کرتے ہیں۔ یہ میراجی کی زندگی کا ایک پہلو ہے جبکہ دوسرا پہلو جو کہ ان کی ادبی زندگی سے بالکل الگ کرتا ہے اور دونوں میں ہم آہنگی بالکل نہیں ہے۔ اعجاز احمد کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

میراجی کی نثر کی اخلاقیات موجودہ معاشرے کی اخلاقیات ہے۔ اور قدم قدم پر خود اس کی زندگی اور شاعری کی نفی کرتی ہے۔ میراجی تمام عمر دو حصوں میں بٹا رہا اور ایسی دوہری اخلاقیات برتتا رہا جس کی ایک شق کا دوسری شق سے علاقہ نہ تھا۔ ایک تو وہ قطعاً نئی غیر روایتی اخلاقیات جو اس کی شاعری کی اساس بنی اور ایک وہ حیرت ناک حد تک روایتی اخلاقی پابندیاں، جن کی کسوٹی پر اس نے اپنے نثری مضامین میں دوسرں کو پرکھا اور سزاوار ٹھہرایا۔

میراجی کی ادبی اور ذاتی زندگی میں بظاہر کوئی علاقہ نہ تھا لیکن جب ہم ایک شاعر کی

نفسیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی تحریروں کا صحیح تجزیہ کر سکتے ہیں۔اور یہی رمز وکنایہ اور انتشار ان کی پوری شاعری میں دیکھنے کو ملتی ہے۔صلاح الدین احمد کی مندرجہ ذیل اقتباسات میرا جی کی حوالے سے ملاحظہ فرمائیں:

میرا جی اپنے رسیلے گیتوں ،اپنی کنایاتی نظموں اوراپنے بے قافیہ اشعار کی ابہامی کیفیتوں کے اعتبار سے اردو کے شعری ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔اوراس امر سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اردو میں نظم بے قافیہ اور نظم آزاد کا فروغ اوراس کے وسیلے سے پیچیدہ تاثرات شدید جذبات اورنازک محسوسات کا اظہار ایک بہت بڑی حد تک میرا جی کے گونا گوں شعری تجربات کا مرہون ہے۔اپنے عروج کے ایام میں میرا جی کی نظم نے ایک ماورائی کیفیت اختیار کرلی تھی اور ایوان شعر میں ایک طلسماتی سی روشنی پھیلادی تھی۔پھراس روشنی سے بیسوں اور مشعلیں روشن ہوئیں اور بہت سی اور قندیلیں جگمگائیں اور شعر کی مملکت میں معانی کا سکہ چلا اور زبان کی وسعتیں فکر کا سہارا پا کرانجانی حدود تک پھیلتی چلی گئیں۔اوراس میں بھی کسے کلام ہے کہ آج میرا جی ہمیں یاد ہے تو اردو کے ایک بہت بڑے نفسیاتی شاعر کی حیثیت سے یاد ہے کہ اوراس کی یہ حیثیت اوراس کا یہ امتیاز شاید ہمیشہ تک باقی رہے گا۔لیکن یہ ایک بہت بڑا لیکن ہے۔میرا جی کا وہ کارنامہ جواس کی عظمت کا ایک بہت بڑا عنصر ہے اور جس کا دائرہ سخن فہم خواص ہی تک محدود نہیں، بلکہ جو ہم جیسے عوام کو بھی اپنے حلقہ سحر میں اسیر کر لیتا ہے اس کی لازوال نثر ہے۔جس کی نیرنگی اور جس کا نکھار،جس کی شوخی اور جس کی متانت جس کی نفاست اور جس کی سادگی ،جسکی نزاکت اور جس کی نشتریت ،جس کا تنوع اور جس کا پھیلاؤ دیدنی ہے۔گفتنی یا شنیدنی نہیں۔اور شاید یہی وجہ ہے، بلکہ غالبًا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی حریف یعنی اپنے خالق کی شاعری کے دامن میں یوں سمٹ کر رہ گئی جیسے اسے زندگی کی روشنی پانے کا کوئی حق ہی نہیں تھا۔اور یہ ناانصفی پہلی بار نہیں ہوئی۔اقلیم ادب کا یہ ظالمانہ رواج ایک عرصہ دراز سے قائم ہے اور اردو میں بھی میرا جی سے پہلے اس کی متعدد نظائر موجود ہیں۔خود غالب کی نثر بھی ایک عرصہ دراز تک قبول سے ناآشنا رہی۔

میراجی کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے وہ فنی تقاضوں کو برتتے ہوئے رمزو کنایہ میں اپنی گفتگو کرتے ہیں۔صلاح الدین احمد نے آزادنظم کے فروغ دینے میں میراجی کے کردار کو واضح کیا ہے۔ بلکہ اس کے فروغ دینے میں میراجی کی جذباتی انفرادیت کو خاص دخل رہا ہے۔صلاح الدین احمد نے میراجی کی شاعری کونفسیاتی نقاد کی صفت سے پرکھنے کی سعی کی ہے۔ان کے مطابق آزادنظم میں میراجی کا شاعری کرنااور پھراس کی وجہ سے آزادنظم کوفروغ حاصل ہونا میراجی کی افتاد طبع کا ہی نتیجہ تھا۔اگران کی زندگی شدید جذباتی کیفیت سے نہ گزرتی تو موجودہ دور میں اتنا اہم شاعر ہمارے سامنے نہ ہوتا۔ان کی شاعری زمانے کی آسائش اور محبتوں سے بھری ہے۔میراجی کی شاعری میں سوخی اور جونشتریت ہے وہ ان کی طبیعت کی وجہ سے ہے۔میراجی نے خود اپنے مضامین بعنوان پرانے ہندوستان کا ایک شاعر امارو کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس بیان کرتے ہیں۔

''ویدوں کے زمانے میں شادی بیاہ پرتو پابندی تھی لیکن ذات پات کے بندھن کوئی نہ تھے۔ان بندھنوں کے لیے ہندوستان ان برہمنوں کا ممنون ہے جنہوں نے منو سے لے کرآئندہ ہر زمانے میں اپنے فرقے کی طاقت کو بڑھانے کے لیے مساوات کے اصول کو بھلا دیا۔جب ویدوں کا زمانہ ختم ہوا اور مہا بھارت اور رامائن کا دور آیا تو ذات پات کا جال سخت ہونے لگا اور پیشے روز بروز وارثتی حیثیت اختیار کرتے گئے۔ابھی تک چونکہ برہمنوں ہی کو مطالعے کا حق اور فرصت حاصل تھی اس لیے وہی ادب کے بانی ہوئے اور شروع میں شاعری بھی مذہبی رنگ ہی لیے رہی۔ذات پات کے بندھن تو سخت ہوئے لیکن رامائن

اور مہابھارت کے زمانے میں بھی برہمنوں کو کوئی امتیازی درجہ حاصل نہ تھا۔ وہ صرف کل انسانوں کے ایک گروہ ہی کو ظاہر کرتے تھے بلکہ رامائین میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ ایک کشتری کا درجہ برہمن سے بڑھ کر ہے۔ جینیوں نے بھی بخود کشتریوں کو سب سے اعلیٰ سمجھنا اور کہنا شروع کردیا۔ اور بدھ لٹریچر میں تو برہمن کو نیچ بھی لکھا ہے۔''

میراجی کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر غائر تھی ان کی سوچ وفکر کی جڑیں ہندوستانی سماج اور معاشرہ میں پیوست تھیں۔ وہ جدید تقاضوں کو برتتے ہوئے قدیم ہندوستان کی قدروں اور نظام زندگی اور ان کے نشیب وفراز سے اچھی طرح واقف ہیں اس کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی قدیم شاعر پر قلم اٹھاتے ہیں اس طرح ''امارو'' پر مضمون کے دوران قدیم ہندوستان کی نسلی تفریق کی تاریخ کا بیان بھی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں۔ اکثر اردو وادباء پر تنگ ذہنوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ ان کے استعارے اور تشبیہیں ایران وعرب سے مستعار ہیں۔ لیکن وہ لوگ یہ بات کہنے سے پہلے میراجی کی شاعری اور ان کی نثری تخلیقات کا مطالعہ کریں تو اس طرح کے الزام سے وہ ضرور نادم ہوں گے۔ اس طرح کی دوسری مثالیں میراجی کے دوسرے مضامین میں مل جائیں گی۔ میراجی نے خود اپنے مضمون بعنوان میتھالی کا عظیم ویشنو شاعر ودیاپتی کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس بیان کرتے ہیں۔

''تیرہویں صدی میں متھلا میں دوشاہی گھرانے سب سے بڑے شمار کیے جاتے تھے۔ ایک سگرانو اور دوسرا اسمرانو، راجہ شیوسگرانو گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس گھرانے کی حکومت کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب دہلی میں غیاث الدین تغلق کی موت ہوئی۔ راجہ شیوسینہ راجہ دیوسنیہ کا بیٹا تھا اور اس کی راجدھانی باگ متی گجرتھ پور میں دریا کے کنارے تھی۔ ودیاپتی نے اپنے گیتوں کے آخر میں اپنے مہربان راجہ اور ان کی رانی کا نام دیا ہے۔ اس

سے بعض لوگوں کو اسی زمانے میں کئی طرح کے شکوک پیدا ہو گئے کہ راجہ کا نام تو دیا لیکن رانی کی نام دینے کی کیا ضرورت تھی۔ اس میں ضرور کوئی خاص بات ہے۔ لیکن ودیا پتی کئی راجاؤں کے دربار میں رہ چکا تھا اور جس راجہ کا نام بھی اس نے اپنے کلام میں لکھا ہے کہ اس کے ساتھ ہی اس کی رانی کا کا نام بھی لکھا ہے۔ یہ اس کا ایک خاص سلیقہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی شادی شدہ تھا۔ چنانچہ اس کے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کا پتہ بھی چلتا ہے۔ متھلا میں کہا جاتا ہے کہ راجہ شیو کے محل میں ودیا پتی کے گیت خاص اہتمام سے گائے جاتے تھے۔ محل میں راجہ شیو اور اس کے پہلو میں رانی لکشمی بیٹھتی چاروں طرف دوسری حرمین، داسیاں اور باندیاں ہوتیں اور یوں اس مجمع میں ''چیری'' نام کی خاص گانے والی عورتیں شاعر کے گیتوں کے نغمے فضا میں منتشر کرتیں۔''

میراجی جہاں شاعر کا ذکر کرتے ہیں وہیں اس کے زمان و مکان اور معاشرتی حالات کا ذکر ضرور کرتے ہیں وشنو شاعر ودیا پتی پر اپنے مضمون کے دوران اس وقت کو تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ میراجی کی شاعری کو جدید تقاضوں کے مطابق کرنے کی ضرورت ہے۔ بین العلومیت کے اس دور میں ادب کا مطالعہ اگر تاریخ اور سماجیات کے تقاضوں سے ہٹ کر کیا جائے تو اس کی ترسیل مکمل نہیں سمجھی جاتی ہے۔ میراجی نے ودیا پتی کے شاعری کی اہمیت ایوانوں میں انکی شاعری کے چرچے اور عوام میں اس کی مقبولیت کے بارے میں تشفی بخش مواد فراہم کیا ہے۔ جس سے اس دور کے شاعر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ میراجی کے اسلوب کا کمال تھا کہ نظم ونثر میں یکساں طور پر عبور رکھتے تھے۔ جو انہیں ایک عظیم تخلیق کار ثابت کرتے ہیں۔ میراجی نے خود اپنے مضمون میں بنگال کا پہلا شاعر چنڈی داس کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس بیان کرتے ہیں۔

دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں بدھ مت کا ایک مشہور عالم کا بھٹ گزرا ہے۔ یہی بنگالی زبان میں سہجیہ مسلک کے عشقیہ گیتوں کا سب سے پہلا نمائندہ تھا۔ جس عشق کا ذکر اس کے گیتوں میں کیا گیا ہے اسے سماج کی رضامندی حاصل نہ تھی۔ اپنی بیوی کی محبت سہجیہ والوں کے

خیال میں انسان کو تکمیل کے اونچے درجے تک نہیں پہنچا سکتی۔ کانو بھٹ کے گیتوں میں ایسے مقام بھی آتے ہیں جو عریانی سے بڑھ کر فحاشی کے درجے تک پہنچے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں تصوف کی ایک ایسی روحانی اہمیت موجود ہے جن کی شرح و وضاحت ایک بلند روحانیت کی حامل بھی ہو سکتی ہے۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ میرا جی وسیع مطالعہ کی وجہ سے اپنے دور کے ہی نہیں بلکہ قدیم زمانے کے اہم شعراء پر بھی قلم اٹھاتے ہیں وہ اس کے زمان ومکان کے علاوہ شاعر کی نفسیاتی کیفیت کے مطالعہ کے ساتھ اس کی شاعری کا مقام و مرتبہ متعین کرتے ہیں۔ کانھو بھٹ جو کہ ایک بنگلہ شاعر ہے۔ اس کا مطالعہ بھی میرا جی نے اسی تناظر میں کیا ہے مضمون کے مطالعے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کانھو بھٹ اور میرا جی میں بہت حد تک مطابقت تھی۔ میرا جی اس کے روحانی کردار سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بدنصیب سماج کے بدنصیب شعراء سے میرا جی کو ایک فکری و قلبی لگاؤ تھا لہذا انہوں نے اس طرح کے بہت سے شعراء وادباء پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے ایک مضمون بعنوان امریکہ کا تخیل پرست شاعر ایڈ گر ایلین پو میں یوں رقم طراز ہیں۔

''پو کی زندگی میں سب سے تلخ حقیقت جو ہمیں دکھائی دیتی ہے وہ اس کی بدنصیبی ہے۔ ایسے بدنصیب انسان جس کی ذہانت میں عظمت کا جوہر موجود ہونا خاص طور پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت ایک حکایت بن جاتی ہے۔ ان کی زندگی کے ارد گرد رشوت کا جال تن جاتا ہے، اور اس حکایت اور ان کے روایات کی ہر کوئی من مانی شرح کرنے پر اتر آتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ذہانت میں کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اپنے طور پر وہ خوش قسمت ذہین لوگوں ہی کی مانند ہوتے ہیں لیکن بظاہر ان کی ذات میں دنیا کوئی

الجھنیں دکھائی دیتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی ذہانت اور زندگی کی متضاد کیفیتیں بیرونی دنیا میں بھی متضاد عکس ڈالتی ہیں۔میر تقی کا افسانہ کسی کے لیے صرف ایک بدد ماغ ذہانت کا فسانہ ہے،کسی کے لیے اس ناکام عاشق کی کہانی ہے جسے کسی اپنی رشتہ دار لڑکی سے محبت تھی اور کوئی آج اس کے کلام سے اس کے میلان ہم جنسی کے دلائل مہیا کرتا ہے اردو کے ایک اور شاعر انعام اللہ خاں یقین کی شخصیت ابھی لوگوں کی نظر میں زیادہ مانوس نہیں ہوئی۔ ورنہ اس کے تعلق میر تقی سے بھی بڑھ کر مختلف قیاسات کا امکان ہے۔اور آج بھی ایک دو شاعر اردو ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں۔جن کے متعلق ان کی موت کے بعد اسی قسم کے مختلف قیاسات قائم کیے جائیں گے۔انگریزی ادب میں پو کے متعلق جو بھی کتاب لکھی گئی ہے ایک نئے نقطۂ نظر سے کوئی اسے شرابی کہتا ہے۔کوئی اعصابی مریض،کوئی اذیت پرست اور کوئی جنسی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے۔ اوران رنگارنگ خیال آرائیوں کی وجہ سے اصلیت پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ اٹھائے نہیں بنتا ہے۔“

میراجی نے امریکی شاعروں کی ذہنی پیچیدگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کی نفسیات کا اثر جو کہ اس کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ایک ذمہ دار نقاد کی طرح نبھایا ہے۔جس کی وجہ سے مختلف زمانوں میں شعراء کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے اور نقادوں اور دانشوروں کی آراء میں اختلافات پایا جاتا ہے لیکن میراجی کی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ کسی شاعر یا ادیب پر قلم اٹھاتے

ہے تو اس کو اس کی زندگی کے حالات اور اس کی نفسیاتی کیفیت کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ پھر اس کی شاعری میں ہم جنسی کے میلان یا اس کی بد دماغی پر تنقید کرنے کے بجائے منصفانہ نقطہ نظر سے تجزیہ کرتے ہیں۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح وہ ایک زمانے تک بے قدری کے شکار رہے ہیں ایسے بہت سے شعراء کو جو کہ اپنے زمانوں میں بے قدری کے شکار رہے ہیں ان کی اہمیت کو منوانے کا بیڑا اٹھاتے ہیں۔ اس کے لیے وہ کئی بار بہت پیچھے تاریخ میں چلے جاتے ہیں۔ اور اس دور کی کھری کھوٹی سچائیوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس طرح میراجی کو نہ صرف ایک شاعر بلکہ ایک نفسیاتی نقاد کی فہرست میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ بالکل نہیں گھبراتے ، میراجی جو کہ بیک وقت تاریخ، سماج، سیاسیات، نفسیات میں ادب کی جڑیں تلاش کرتے ہیں۔ وہ اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں ملاحظہ ہو ایک اقتباس جو کہ فرانس کے شاعر کا ہے۔

میراجی نے اپنے مضمون میں فرانس کے ایک آوارہ شاعر چارلس بودلیئر کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس بیان کرتے ہیں۔ ''آج سے پچیس صدی پہلے یورپ کے ادب اور آرٹ کا ماخذ یونان کی زرخیز ذہانت تھی۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں یہی درجہ اطالیہ کو میسر حاصل ہو گیا لیکن دور جدید میں فرانس نے ادب اور آرٹ میں سارے یورپ اور خصوصاً انگلستان کی رہ نمائی کی۔ جمالیاتی تحریکات سے متاثر ہونے میں فرانسیسی شعور نے جدید زمانہ میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا اور چونکہ فرانسیسی شعور بہت باریک نظر اور حساس تھا اس لیے آئے دن تبدیل ہوتے رہنے والے ماحول کے مختلف اور متنوع انداز کو فرانس نہایت سچائی اور اخلاص کے ساتھ نشر کرتا رہا۔ چارلس بودلیئر نے اپنے واحد مجموعہ نظم ،گلہائے بدی'' کو فرانس کے مشہور ناول نگار تھیوفائل گوئٹے کے نام پر معنون کیا۔ یہ کتاب 1857 میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت پر شاعر کے خلاف مقدمہ چلایا گیا کہ اسنے ایک ایسی کتاب شائع کی ہے کہ جو اخلاق عامہ کے لیے مضر ہے۔''

چارلس بودلیئر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار میراجی نے کیا ہے فرانس کی عظیم تاریخ کے ساتھ ساتھ شاعر اور اس کے فن پر سخت تنقید کرتے ہوئے اس کی قدر و منزلت طے کر دی

ہے۔محمود ہاشمی نے اپنے مضمون میں میراجی کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس بیان کیے ہیں۔

میراجی غالب کے بعد فن کی نجات اور نئی زندگی بخشنے والا،اردو ادب کا دوسرا محور ہے۔یہ اتفاق نہیں حقیقت ہے کہ میراجی کی نظمیں،یا پہلا مجموعہ 1944 میں شائع ہوا اس مجموعہ میں 1932 سے 1943 تک کی نظمیں ہیں۔میراجی کے پہلے مجموعہ کے اس کیلنڈر سے ملحقہ ایک اور تاریخ 1938 کی ہے۔جب گراں بار،کوہ وقار مجموعوں کے شاعر محمد اقبال(علامہ)اپنی شہرت ومقبولیت کے نقطہ،عروج پر پہنچ کر رخصت ہوئے۔کہا جاتا ہے علامہ،اردو شاعری کی سب سے بلند اور پروقار آواز ہیں۔اس سے انکار کی یہاں ضرورت نہیں۔لیکن اس اقرار پر تامل نہیں کہ اقبال اپنے عروج میں اور میراجی اپنے آغاز میں ایک دوسرے کے ہم عصر ہیں۔ایک کی شخصیت گمنام اور بے اثر دوسرے کی شخصیت کی آواز بازگشت براعظم کو عبور کرتی ہوئی اور تاثر میں عوام وخواص کی حدود کو بے محابا طے کرتی ہوئی۔لیکن علامہ اپنی عظمت کے تمام کھڑاگ کے ساتھ تاریخ کے ARENA تنہا رہ جاتے ہیں۔ان کا نام چلتا ہے تو لے دے کر،امین حزیں سیالکوٹی اور اس قبیل کے شعر طرازوں تک۔میراجی کی شخصیت،علامہ کے تناظر میں بے حد عجیب نظر آتی ہے۔آنے والی نسل کے میراجی کے اسلوب کو،میراجی کے طرز احساس کو،میراجی کے نظریہ شعر کو قبول کرتی ہے اور علامہ کا اثر ان کے اپنے ARENA سے باہر نہیں نکل پاتا۔علامہ ایک پروقار،یادگار،کا نقش بن جاتے ہیں اور میراجی آنے والوں کا ہم سفر ہے۔بیسویں صدی کی چار دہائیاں،ماضی کی صدیوں پر بھاری ہیں لیکن میراجی ہنوز نئے آنے والوں کا ہم سفر ہے۔

محمود ہاشمی نے میراجی کو اس دور کا بہت اہم شاعر تسلیم کیا ہے۔وہ اقبال کے طرز سے موازنہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آج میراجی کے پیروکار زیادہ ہیں جبکہ اقبال کو ان کے زمانے سے آج ہر لحاظ سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔میراجی جو کہ ایک گمنام اور آزادانہ زندگی گزارنے والا قلندر شاعر تھا۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ سماج سے اس کا رشتہ کتنا مضبوط ہے اور اس کے طرز کی اتباع کرنے والے کتنے ہیں۔یقیناً میراجی اس میں آگے نہ سہی جیسا کہ محمود

ہاشمی کا خیال ہے لیکن میرا جی اس ہنر میں کامیاب ضرور ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنے مضمون میں ''میرا جی دھرتی پوجا کی ایک مثال'' کے بارے میں مندرجہ ذیل اقتباس بیان کرتے ہیں۔ میرا جی کی نظموں اور گیتوں کی ایک مخصوص فضا ہندو دیوتا مالا اور فلسفے سے میرا جی جذباتی ہم آہنگی نیز کرشن رادھا کے پجاری شاعروں سے اس کا تعلق خاطر ہے۔ یہ سب باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں۔ کہ میرا جی نے دھرتی پوجا کی ایک اہم مثال قائم کی ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس خاص میدان میں جہاں تک اردو نظم کا تعلق ہے میرا جی کی حقیقت منفرد اور یکتا ہے۔ اردو نظم گو شعراء میں سے شاید ہی کسی نے اپنے موضوع سے اس قسم کی جذباتی وابستگی شغف، اور زمین سے ایسے گہرے لگاؤ کا ثبوت پہنچایا ہے۔ جیسا کہ میرا جی کے ہاں نظر آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں میرا جی کی شاعری نے اس کی اپنی جنم بھومی سے خون حاصل کیا ہے اور اسی لیے اس میں زمین کی کی خوشبو، حرارت اور رنگ بہت نمایاں ہے۔ میرا جی کی عظمت ایک بہت بڑی حد تک اس کے اسی رجحان کے باعث ہے۔ پھر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ میرا جی کے بعد آنے والے بہت سے نظم شعرا میرا جی سے بڑے واضح اثرات قبول کیے ہیں اور اس کی علامتوں، اشاروں، سوچنے کے خاص انداز اور بیان کے مخصوص پیرائے کو پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ اردو نظم کا وہ طالب علم جس نے میرا جی کی نظموں کا مطالعہ کیا ہے بڑی آسانی سے جدید نظم گو شعرا کے ہاں میرا جی کے اثرات کی نشاندہی کر سکتا ہے۔

اکثر شعراء قدیم اور جدید کے یہاں دیکھا گیا ہے کہ وہ غیر ملکی یعنی ایران وعرب تشبیہات وتلمیحات استعمال کر کے اپنی شاعری میں زور پیدا کرتے ہیں اور وہ اس میں کامیاب بھی ہیں لیکن میرا جی نے خالص ہندستانی تہذیب وثقافت، یہاں کے رسم ورواج، شادی بیاہ اور اس کے علاوہ ہندو دیومالا سے اپنی شاعری میں ایک طلسماتی رنگ بکھیرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا جی نے اردو زبان وادب کے تخم کو ہندوستان کی زرخیز مٹی میں اگا کر تناور درخت بنا دیا۔ میرا جی کی شاعری کے مطالعہ کے بعد نقاد کچھ بھی رائے قائم کریں لیکن خلاصہ یہی ہے کہ

میراجی نے ایک ایسے طرز کی ایجات کی جو کہ نیا منفرد تھا اور اس نے خاص رجحان کے تحت ایک نئے مجاز اور ایک نئے ذائقہ سے اردو شاعری کو آشنا کیا۔ اس مضمون میں شامل دیدہ ور نقادوں کی آرا کی روشنی میں جس کا ذکر کیا گیا ہے اس بات کی دلیل ہیں کہ میراجی کسی مخصوص طبقہ، علاقہ، تہذیب اور قوم کے شاعر نہیں بلکہ جغرافیائی حدود سے اوپر اٹھ کر انسانی تہذیب وثقافت اور ہندوستان کی مٹی کے شاعر ہیں۔ آج جبکہ چاروں طرف نفرت، ظلم وبربریت کا دور دورہ ہے۔ میراجی کی سوچ وفکر سے ایک مستحکم اور پرامن مشاعرہ کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے شعری سرمایہ سے اسفادہ کیا جائے۔

آج جہاں موجودہ دور میں ادب نے ترقی کی بلندیاں کو چھوا ہے۔ ادب کے پرکھنے اور اس کو جانچنے کی طرف جس طرح سے نقادوں کا میلان ہوا ہے۔ میراجی جیسا عظیم شاعر جس نے اردو شاعری میں نئے طرز کی بنیاد ڈالی اور اپنے پیچھے متبعین کی ایک لمبی فہرست تیار کی اس پر کیے گئے تحقیق اور مقالوں کی تعداد کم ہے۔ جس کی وجہ سے ان کو سمجھنے میں اور ان کے پیغام سے مستفید ہونے میں دشواری پیش آئی ہے۔ میراجی پر آج تک اس طرح سے کام نہیں ہوا ہے جس کے وہ حقدار تھے۔ آج جبکہ ان کی پیدائش کے سال کی تقریبات منائی جارہی ہیں۔ حیدر قریشی کی یہ کاوش قابل تحسین ہے۔ جس کو اردو والے کبھی فراموش نہیں کریں گے۔

حواشی:

(1)اردوشاعری پرایک ایک نظر	کلیم الدین احمد	مکتبہ فروغ اردو،لکھنؤ	1925
(2)اردونظم-نظریہ وعمل	ڈاکٹرعقیل احمد صدیقی	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	1989
(3)اردوشاعری کا مزاج	ڈاکٹر وزیر آغا	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	1997
(4)اردوادب میں نظم معریٰ اور آزاد نظم	حنیف کیفی	جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی	1986
(5)اردوشاعری میں اشاریت	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	موڈرن پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی	1983
(6)شعرغیر شعرونثر	شمس الرحمٰن فاروقی	شب خون کتاب گھر	1997
(7)کلیات میراجی	جمیل جالبی	اردومرکزلندن	
(8) میراجی ایک مطالعہ	جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1992
(9) میراجی شخصیت وفن	ڈاکٹر رشید امجد	مغربی پاکستان اردو اکادمی	1992
(10) میراجی شخصیت وفن	کمار پاشی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی	1981
(11)نئی شعری روایت	شمیم حنفی	مکتبہ جامعہ،نئی دہلی	1978
(12)مضامین نو	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ	1995
(13)میراجی کی نظمیں	مرتب مرغوب علی	نصرت پبلشرز لکھنؤ	1986

رسائل وجرائد:

(1)تخلیقی ادب کراچی	شمارہ 4	
(2)سوغات بنگلور	شمارہ نمبر 87	
(3)شعروحکمت حیدرآباد	کتاب اول	1987
(4)علی گڑھ میگزین	شمارہ اول	1957

لوک ادب: ایک تفہیم

یوں تو لفظ ''لوک'' سے مراد انسان، آدمی، بشر، لوگ، مرد، عالم ارواح، دنیا، عالم، جہان ہوتے ہیں، لیکن اردو ادب میں لوک ادب سے مراد نچلے طبقے کے ذریعہ خلق کیا گیا وہ ادب ہوتا ہے جس کا تعلق قدیم قبائلی نظام اور اس میں موجود رسم و رواج، بولی ٹھولی، تیج تہوار اور مذہبی رسومات وغیرہ سے ہے۔ لوک ادب انسان کے ذہنی ارتقا کا علامیہ ہے۔ توہمات کو ذہنی ارتقا میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور ان توہمات سے ابھرنے والے احساس اور آزادی کی جستجو نے لوک ادب کو جنم دیا۔ لوک ادب سے موضوعات کا تعین ایک مشکل کام ہے، لیکن ہمارے دائرہ نظر میں جو موضوعات ہیں، ان میں کائنات کی تکوین، اس کے نظم وضبط، دیوتاؤں کی پیدائش، انسان کی تخلیق، دیوی دیوتاؤں کی محبت، نفرت، بے پناہ عشق رقابت، بغض، کینہ، عناد، سازشیں اور عذاب وعتاب وغیرہ شامل ہیں۔ لوک ادب کی ابتدا انسانی زندگی کے ارتقا کے ساتھ ہوئی، لوک ادب انسانی وجود کے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے احساسات اور تجرباتی سفر کی روداد ہے۔ ایک طویل عرصے تک یہ سب کچھ سینہ بہ سینہ چلتا رہا۔ تحریر کی صورت اس وقت ممکن ہوئی جب رسم الخط وجود میں آیا۔ لوک ادب کسی نہ کسی تاریخی، تہذیبی، سماجی اور لسانی پس منظر کا حامل ہوتا ہے۔ سماجی پس منظر کے طور پر حیرت انگیز، محیرالعقول اور دلچسپ واقعات وحکایات کو اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے، جس کے سہارے ہم ماضی کے دریچوں میں جھانک کر قدیم سماجی وتاریخی حقائق کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ انسانی معاشرے کے فکری واخلاقی ارتقا وزوال کا اندازہ بھی لوک ادب کے توسط سے لگایا جا سکتا ہے۔ لوکِ ادب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر کسی قسم کی بنیادی تبدیلی یا ترمیم واضافے کو شاذ ہی روا رکھتا ہے اس لیے سیکڑوں بلکہ

ہزاروں سال گزر جانے کے باوجود ان کی شکل وصورت اس حد تک کبھی نہیں بدلتی کہ اصل شناخت ناممکن ہو جائے۔لوک ادب کی یہ خوبی قوموں کی تاریخی،ثقافتی،معاشرتی،فکری،فنی،لسانی اور ادبی خصوصیات کی بقا میں معاون ہوتی ہیں۔کسی بھی زبان میں لوک ادب کے سرمائے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔لوک ادب انسان کا وہ سرمایہ ہے جو اس کی زندگی کو اس کے ادبی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے اظہار سے ملتا ہے۔سماج کے نشیب وفراز،اس کے نظام ترکیبی اور اس کی گنگا جمنی بوقلمونی کیفیتوں کو جس طرح لوک ادب ظاہر کرتا ہے وہ اس کی اہمیت کا ثبوت ہے۔دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح اردو کی بھی عوامی جڑیں ہیں اور اس کا دامن عوامی جذبات کی ترجمانی کرنے والے لوک ادب کی روایت سے مالا مال ہے۔اردو زبان کی تشکیل ہی مختلف قوموں کے باہمی میل جول اور اجتماعی ارتباط کا نتیجہ ہے۔

اردو معاشرے میں بھی اپنی ماؤں سے لوریاں سنی جاتی رہیں،ان کی ولادت پر گیت بھی گائے گئے۔سردیوں کی کپکپاتی اور ٹھٹھرتی راتوں میں ان کی دادیوں اور نانیوں نے کہانیاں بھی سنائیں۔ ان کی گھریلو تقریبات میں ڈھولک کی تھاپ پر کنواریوں اور شادی شدہ عورتوں نے گیت بھی الاپے۔ڈومنیوں نے ان کی شادی بیاہ کے موقع پر شادیانے بھی بجائے۔البیلے موسموں نے ان کے دلوں میں ترنگ بھی پیدا کی۔انہوں نے ساون میں جھولا بھی جھولا۔صدیوں سے ہندوستانی معاشرے میں یہ سب ہوتا آیا ہے۔شمالی ہند میں اردو اور ہندی کا علاقہ مشترک رہا ہے۔دونوں ایک زمین،ایک جیسی تہذیب،مشترک آب وہوا کی پروردہ ہیں۔اردو اور ہندی بولنے والوں کی آبادی اکثر ملی جلی رہی ہے،اس لیے اردو اور ہندی کے لوک ادب،لوک گیت،لوک قصوں،لوک کہانیوں اور لوک کہاوتوں کا بہت بڑا سرمایہ مشترک ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر علاقے کے لوک ادب کو اس علاقہ کی بولیوں اور تہذیبی وتاریخی حقائق نے متاثر کیا ہے۔

1857ء میں جب انگریزوں کے خلاف باغیانہ جذبات کی آگ پھیلی تو عورتوں کے دلوں میں بھی وطن دوستی کے جذبات جاگ اٹھے اور انہوں نے اپنی جرأت اور شجاعت پر مبنی شاعری لوک ادب

کے رنگ میں گائیں، ان میں بہادری اور طاقت و ہمت کی داستانیں بیان کی گئی ہیں۔ تحریک آزادی اور تحریک خلافت کے اجتماعی جوش و خروش کی ترجمانی کے لیے جو عوامی گیت لکھے گئے، وہ لاکھوں انسانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ ''آب حیات'' میں محمد حسین آزاد نے بھی لوک گیتوں کا ذکر کیا ہے۔ رابندرناتھ ٹیگور نے ایک موقع پر لکھا ہے:

''ممکن ہے میرے آرٹ کی شاہکار نظمیں فراموش ہو جائیں

لیکن میرے گیت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

ٹیگور کے گیتوں کی ہمہ گیر مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے بنگال کے عوام کی من موہنی دھنوں میں اپنے گیتوں کو ڈھالا ہے۔ اردو لوک ادب میں بھی ہر موقع کے گیت، ہر تقریب کے گیت ہمارے جذباتی رشتوں اور تہذیبی قدروں کی آئینہ دار ہیں۔ اردو اور ہندی لوک گیتوں کی بعض دوسری اصناف میں بھی بڑا وقیع سرمایہ موجود ہے۔ مثال کے طور پر ''بارہ ماسہ چکی کے گیت، ساون کے گیت، دوہے، چہار بیت، دکھڑے اور زاریاں'' وغیرہ سیکڑوں ایسی اصناف دیہی علاقوں میں مشہور و مقبول ہیں۔ ان کا مقصد کسی قریبی عزیز یا دوست کی موت پر بین کرنا ہوتا ہے۔ ''زاریاں'' موت کے علاوہ دوسری طرح کی مصیبتوں اور دکھ درد کے موقعوں پر بھی عورتیں تنہا یا مل کر گاتی ہیں۔ ''چہار بیت'' پشتو علاقے کی دین ہے، یہ ناخواندہ قبائلی افغانی پٹھان فوجیوں، روہیلوں کے نغمے کی صورت میں پشتو زبان سے اٹھارہویں صدی میں اردو میں آئی تھی اور شمالی ہندوستان میں متعارف کرائی گئی تھی اس کا رواج یوپی کے علاقوں مثلاً رام پور، شاہ جہاں پور، بچھرایوں، سنبھل، امروہہ، مرادآباد، روہیلکھنڈ، راجپوتانہ، بھوپال، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش اور خاص طور سے راجستھان ٹونک وغیرہ میں رہا ہے اور مشرقی بہار کے اضلاع پورنیہ، ارریہ، کشن گنج، کے تعلیمی اداروں میں اس صنف کو جہاں ادبی مقام حاصل ہے وہیں دہقانی زندگی میں یہ ثقافت کا پیش خیمہ بھی ہے۔ چہار بیت شعری محفلوں میں لوگ اجتماعی طور پر کورس کی شکل میں گاتے ہیں اور دف بجاتے ہیں اور جوش و خروش کے عالم میں اچھلتے، کودتے اور ناچتے گاتے ہیں۔

لوک ادب میں عوام کی زندگی، سوجھ بوجھ اور طرز فکر کا عکس صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف پیروں، فقیروں، سوداگروں، کسان، مزدوروں اور شریف گھرانے کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، وہیں دوسری جانب ''چوراچکے، لچے، لفنگے، چرسیے اور بھڑوے بدمعاش'' بھی ملتے ہیں۔ لوک ادب میں عام لوگوں کے خیالات کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ ہزاروں سال سے انسانی تہذیب کا اٹوٹ حصہ بنی ہوئی ہے۔ انسانی سماج کو ہر سطح پر اس کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔ سماج کا ایک بڑا طبقہ لوک ادب کو زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ یہ ایک طرح سے زندگی کے متعلق عوامی فلاسفی یا عوام کے تصورات کا مظہر ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ان میں تبصرہ یا رائے زنی ہوتی ہے۔ لوک ادب میں عوامی کلچر اور عوامی طرز فکر کے سارے ہی پہلو اس خوبی سے سمٹ آتے ہیں کہ اگر کوئی پوری قوم فنا ہو جائے اور لوک ادب باقی رہ جائے تو اس گمشدہ تہذیب کے بیشتر عناصر کو اس کے توسط سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ البتہ ان کے وسیلے سے کی جانے والی بازیافت میں تہذیب کی زیریں سطح یعنی عوامی کلچر کو ہی نمایاں حیثیت حاصل ہوگی۔ کیونکہ لوک ادب نہ صرف عوامی کلچر کی بطن سے جنم لیتا ہے، بلکہ اس کلچر کی تشکیل، تعمیر اور اس کے انضباط و استحکام میں بھی اس کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ یہ ادب عوامی اور اجتماعی ہوتا ہے، اسے عوام اپنے مروجہ عقائد اور رسم و رواج، تہذیبی تصورات اور اجتماعی نفسیات سے قریب پاتے ہیں۔ اسی طرح لوک ادب مختلف ادوار کے عام انسانی سماج کے رسم و رواج، عقائد و افکار اور تجربات و مشاہدات کا آئینہ دار ہے۔ ہندوستانی سماج کے طبقاتی نظام، نسلی امتیاز، امیری و غریبی کا فرق، آپسی بھید بھاؤ اور ذات پات کی تفریق یا پابندی سے متعلق عوامی ردعمل کو بھی اس میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے لوک گیتوں میں سادگی، برجستگی، معصومیت، بے لوث اپنائیت اور سچائی پنہاں ہوتی ہیں۔ یہ تصنع سے دور خلوص و جذبات میں رچے بسے گیت، جب کسی کی سماعت سے ٹکراتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے عقائد، نظریات، زبان، ذات پات، دولت، غربت، آسودگی و افسردگی کی بھی دیوار ڈھے جاتی ہے اور انسان ان تمام بندشوں سے آزاد خالص انسانیت

کے اعلیٰ مقام کو چھونے لگتا ہے۔قومی یکجہتی کی یہی روح ہے جو ان گیتوں میں سمائی ہوئی ہے۔

لوک گیت لوگوں کے دلوں کی گہرائی سے نکلے وہ جذباتی بول ہیں جو شعری ولسانی ضابطوں اور پابندیوں سے آزاد ہیں،لیکن پھر بھی ان میں ایسا لحن اور سُر ہوتا ہے جو سننے والے کو نہ صرف مسحور کرتا ہے بلکہ متاثر بھی کرتا ہے۔

لوک ادب اپنے اندر سماجی،معاشی،معاشرتی اور تہذیبی قدروں کی ایک وسیع دنیا آباد کیے ہوئے ہے۔یہ گیت ہماری تہذیب،رسم ورواج،عقائد اور رشتوں کا جامع انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ان گیتوں کی زبان خواہ کتنی ہی کھردری کیوں نہ ہو،الفاظ اور لہجے میں خواہ کتنا ہی عامیانہ پن کیوں نہ جھلکتا ہو،ادائیگی میں خواہ کتنی ہی بدسلیقگی کیوں نہ ہو،لیکن ان میں جن جذبات کا اظہار ملتا ہے،ان میں امنگ،جوش،ولولہ،مثبت وتعمیری فکر اور سالمیت ویکجہتی کی لہریں ملتی ہیں۔

اردو میں لوک ادب کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ضرورت ہے اس کی تلاش وتحقیق کی۔لوک ادب کے بارے میں برصغیر ہی نہیں،بلکہ یورپ کے ادیبوں اور نقادوں نے انیسویں صدی تک ہتک آمیز رویے کا مظاہرہ کیا اور اسے جاہل گنواروں کی تک بندی اور خرافات کا نام دیا۔حالانکہ مطالعہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ لوک ادب میں مثالی زندگی گزارنے کے ساتھ معرفت حاصل کرنے کی باریکیاں بھی موجود ہیں۔موجودہ دور میں ضرورت ہے کہ لوک ادب پر خاص توجہ دی جائے،اس کے سرمایے کو محفوظ کیا جائے تا کہ تصرف میں لاکر دوسری اصناف کے دامن کو منور کرسکیں جس میں اردو کی ادبی تاریخ کی سرزمین اور زیادہ زرخیز اور وسیع ہو سکے۔

خانوادۂ کریمیہ سلون

کسی بھی ملک کی تاریخ تہذیب کے آئینے میں شناخت کی جاتی ہے اور دیکھا یہ جاتا ہے کہ تہذیب کی اساس کیا تھی۔ کس حد تک اس میں اخذ وقبول کی صلاحیت تھی۔ اور اس میں کس حد تک دوسرے تہذیبی دھاروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی قوت تھی، ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں مختلف تہذیبی دھاروں نے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے۔ اور ہزار ہا برس کی اقوام عالم کی تاریخ اگر آج بھی زندہ ہے تو اس کی وجہ وہ تہذیبی دھارے ہیں جو ایک دوسرے سے اختلافات کے باوجود باہم ربطہ کے خصوصی جوہر اپنے اندر پوشیدہ رکھتے ہیں ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ ہیں مگر سب رنگ مل کر ہندوستانی تہذیب کی بنیاد کا پتھر قرار پاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی جسم میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے بڑی چھوٹی ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔ سنگم پر گنگا اور جمنا کے پانی کا رنگ مختلف ہوتے ہوئے بھی ایک ہوتا ہے اور ان نکات کی نشاندہی کا سب سے موثر ذریعہ تصنیف وتالیف ہے۔ کتابیں تہذیب وثقافت کی امین ہوتی ہیں اور اس کے ذریعہ ماضی کے ورثہ کو مستقبل کے لوگوں تک پہنچا کر کامیابی کی راہیں متعین کی جاتی ہیں انسانی تاریخ کے ہر عہد میں کتابوں کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ بنی نوع انسان کی رشد وہدایت کے لیے خدائے پاک نے انبیائے کرام پر چار آسمانی کتابیں نازل فرمائیں ان کتابوں کے نزول کو فرزندان آدم کے لیے نعمت اور ہدایت کا منبع ومرکز قرار دیا دنیا کی تاریخ میں پیغمبر، صحابہ کرام اولیا وصوفیاء، شاعر وادیب اور ان جیسی ہستیاں گزریں ان سبھوں نے معاشرتی وانسانی نظام کی تشریح کتابوں کے ذریعہ ہی کی ''مسند فقر وارشاد'' سید ظہیر حسین جعفری کی

ایک ایسی کتاب ہے جس میں انھوں نے تاریخ خانوادۂ کریمیہ نعیمیہ سلون کو جمع کر کے عہد حاضر کی کشاکشوں میں روشن و منور خانقاہ کی اہمیت و معنویت کا احساس دلایا ہے۔

ہندوستان میں چشتی سلسلہ کی بنیاد خواجہ معین الدین چشتی نے قائم کی جو کہ پرتھوری راج چوہان کے زمانے میں (1192 کے آس پاس) ہندوستان میں وارد ہوئے ان کے شاگردوں میں خواجہ بختیار کاکی خواجہ فریدالدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی اور ان جیسے بے شمار مشہور صوفی گزرے ہیں ان صوفیا اور اولیاء کی اخلاقی بلندی کے نتیجے میں بہت سے کنبوں اور طبقوں نے اسلام قبول کیا، چشتیوں نے اسلام کو پھیلانے کی غرض سے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک کا بھی سفر کیا شہروں سے قصبات تک اور قصبات سے دیہات تک انھوں نے رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ خانقاہ کریمیہ سلون بھی اسی تحریک کا مرہون منت ہے۔ اس خانقاہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ صدیوں سے رشد و ہدایت اور علم و دانش کا منبع و مرکز رہا ہے اور ہر دور میں صوفیوں، مجتہدوں اور درویشوں کی بدولت اس کی نمایاں حیثیت رہی ہے۔ ہمارے وطن کی تاریخ میں صوفیائے خانقاہ سلون نے جس طرح اپنا کردار ادا کیا اور خدمات انجام دی ہیں وہ چشتیہ سلسلے کی سنہری روایات کا روشن ترین حصہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ عالمگیر پیمانے پر چشتیہ سلسلے کا کوئی تصور خانوادۂ سلون خانقاہ کریمیہ کے بغیر نامکمل اور کسی حد تک معنویت سے خالی ہے۔

کتاب اور اس موضوع سے متعلق حوالہ جات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ صوفیائے خانقاہ کریمیہ سلون جس کا شجرہ اس کتاب کے صفحہ 399 اور 400 پر دیا گیا ہے ان کا سلسلہ طریقت خواجہ معین الدین چشتی سے جا کر مل جاتا ہے وہ صوفیائے خانقاہ کریمیہ سلون، جون پور، کانپور، بجنور، لکھنؤ، سنبھل کے علاوہ ہندوستان اور دنیا کے دیگر ممالک کے صحراؤں میں رہ کر عبادت و ریاضت کرتے رہے خلق خدا کو اسلام کی دعوت دیتے رہے اور عوام الناس حمایت و معاونت نیز انہیں روحانی غذا فراہم کرتے رہے اور آج بھی صوفیاء سیلون کے ذریعہ یہ سلسلہ جاری ہے یہ لوگ چشتیہ سلسلے کے روح رواں ہیں ان سے عقیدت رکھنے والوں میں ہندو مسلمان سبھی ہیں۔ اس

کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ خانوادۂ سلون کے روحانی تہذیبی واخلاقی نقوش کو یکجا کیا جاسکے۔اس لیے اس کتاب میں خانقاہ سلون اتر پردیش ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی ان روایات اور تاریخ کو پیش کیا گیا ہے جس سے عالمی شرعی مذہبی تہذیب نے فائدہ اٹھایا ہے اور دنیا بھر کے صوفیوں، عالموں، دانشوروں نے خود سلون میں بیٹھ کر اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں گھوم کر وہاں کی تہذیبی و مذہبی بیماریوں کو سمجھا اور انہیں دور کرنے کے نسخے ایجاد کیئے۔اس خانقاہ میں مذہب اسلام کے شرعی اصول وضوابط اور صوفیاء کے کسب فیض کے اسرار ورموز پوشیدہ ہیں۔ سرزمین سلون ایسے بزرگوں سے بھری پڑی ہے کیسے خوش نصیب ہیں وہاں کے لوگ کہ جنہیں مولانا حافظ شاہ محمد مہدی عطا، حضرت شاہ محمد نعیم عطا، سید شاہ محمد حسین جعفری، مولانا سید شاہ احمد حسین اور ایسے ہی نہ جانے کتنے صوفیا کرام واولیاء اسلام کی قربت نصیب ہے اور انکی قدموسی کے آسان وسیلے حاصل ہیں انکی تعلیمات کے حصول کا سہل ترین راستہ حاصل ہے وہ فیض اور نظر کرم حاصل ہے جس کی بدولت دین ودنیا کی دولت میسر ہوتی ہے اسلامی عقیدہ ہے کہ خدا نے ہر صدی کے اواخر میں ایک ایسا انسان زمین پر بھیجنے کا وعدہ کیا ہے جو گردش وقت کے باعث پیدا ہوئی اخلاقی گراوٹ اور زوال پزیر مذہبی اقدار سے بنی نوع انسان کو ابھار کر سچے دین کو پھر سے قائم کرتا ہے۔یہی خدمات خدائے پاک نے صوفیائے سلون سے لیا ہے۔کتاب کے مطالعہ کی روشنی میں اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ خانقاہ سلون شریف اپنی قدامت کے باوصف نوادرات کا قدیم و کثیر سرمایہ اپنے پاس رکھتا ہے خانقاہوں میں عموماً بزرگان دین کا عمامہ، عباء، تسبیح، جائے نماز، کلاہ اور ذاتی استعمال کی چیزوں کے علاوہ خلافت نامے، کتابیں، بادشاہوں صوفیا کرام اور بزرگوں کی قدیم تحریریں مخطوطات وغیرہ محفوظ رہتی ہیں، خانقاہ سلون کے صوفیا کرام عالم باعمل ہیں یہ روحانی شہنشاہ اور راہ طریقت کے بادشاہ تھے جنکے روحانی کمالات کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہے۔انھیں تبحر علمی جاگیر میں ملی تھی ذمہ دار سرکاری عہدہ قبول کرنے کے باوجود ان بزرگوں نے صدیوں سے تزکیہ نفس، صفائے قلب فقر وقناعت، تبلیغ دین، تزکیۂ باطنی رشد وہدایت، علم دین کی ترویج

واشاعت روحانیت کی تبلیغ اور کردار سازی کا کام بھی کیا اور مظلوموں کی دادرسی بھی کرتے رہے خود مصنف کتاب فرماتے ہیں۔''ایسے عظیم المرتبت خانوادے کی تعلیمات، تبلیغی خدمات علمی اور روحانی کاوشیں تاریخی کتابوں، تذکروں اور سرکاری دستاویزات میں پھیلی ہوئی تو ہیں ہی عوامی حافظے کا جزو بھی بن چکی ہیں۔خانقاہ سلون جہاں ہر سال عرس کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے زائرین بلا امتیاز مذہب وملت نذرانہ عقیدت پیش کرنے آتے ہیں یہ خانقاہ ہندوستان کے ان مقدس مقامات میں سے ہے جہاں بڑے بڑے بادشاہوں نے اپنا سر نیاز خم کیا ہے۔اس آستانہ پر ہر فرقہ ہر قبیلے کے لوگ کثیر تعداد میں حاضر ہوتے ہیں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ خانقاہ سلون پوری دنیا میں شہنشاہی کرتا ہے جو انسانی نسلوں کو قومی یکجہتی اور باہمی محبت کا درس دیتی ہے جو صوفیا ہائے سلون کا مشن ہے۔'' کتاب کے مطالعہ ومشاہدے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلون کے صوفیوں کا یہ چشتیہ خاندان ایک زندہ متحرک اور ہر آن آگے بڑھتا ہوا نظام حیات ہے جو ہر عہد ہر خطہ اور ہر سطح کے مسائل کا حل رکھتا ہے جو آج بھی ایسا ہی قابل عمل ہے جیسا کہ اصحاب صفہ کہ زمانے میں تھا تزکیۂ نفس کی اہمیت انسانی زندگی میں آج بھی اتنی ہی ہے جتنی ازمنہ وسطی میں تھی ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے اس امتیازی وصف سے دنیا کو اس کی ذہنی سطح کے مطابق روشناس کرایا جائے عہد حاضر کی عقل ومنطق اور معیار کے مطابق اسے ثابت کیا جائے اور حکمت اور دانائی کے ساتھ اسے پیش کیا جائے یہ سلسلہ امن، میانہ روی، فراخ دلی اور رواداری کا علم بردار ہے۔کتاب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ذوق نظر کا مسافر اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا جہاں خوب کی دریافت نے خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو کی کشمکش یک لخت ختم کردی ہے کسی کتاب کے حسن و جمال اور دلکشی ودل آویزی کا دارومدار دو چیزوں پر ہوتا ہے ایک کتاب کا موضوع اور دوسرا مصنف کا طرز بیان اور موضوع کا حق ادا کرنے کی اس کی اپنی ذاتی صلاحیت اور استعداد کسی کتاب میں یہ دونوں وصف جس درجہ کی ہوگی کتاب کی اہمیت اور اس کی افادیت بھی اسی درجے ومرتبے کی ہوگی۔

ظاہر ہے کہ جس کتاب کا موضوع صوفیائے کرام کی اعلی ذات وصفات ہو اس کے موضوع پر بات کرنا ہی لا حاصل ہے کیونکہ اس تذکرے کے پڑھنے سے جسم میں زندگی کی حرارت اور روح میں غیر معمولی بالیدگی اور تراوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانیت شرافت ونجابت کی اعلیٰ قدریں دل ودماغ میں راسخ اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔ نیکی اور پرہیزگاری کا ولولہ پیدا ہوتا ہے اور جذبات سفلی سرد ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب تذکرہ ہے ان عظیم ترین شخصیات کا جو سراپا جمال وکمال اور مجسم خوبی ورعنائی ہے۔

حسن یوسف دمِ عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اب رہا کتاب کا دوسرا وصف یعنی مصنف کا طرز بیان اور موضوع کا حق ادا کرنے کی صلاحیت تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسی خانوادے سے تعلق رکھنے والے پروفیسر سید ظہیر حسین جعفری اس عہد کے نامور اہل نظر اور نہایت جید عالم وتاریخ داں ہیں۔ ان کی زندگی ایک بین الاقوامی دستور حیات ہے جو قرآن کے ابدی وصولوں کی تعبیر ہے۔ موصوف کا ایک ہی مدعا ہے کہ چشتیہ سلسلہ کو سمجھنے کے لیے صوفیائے سلون کے مشن کی روح کو سمجھنا لازمی ہے۔ جس کی رشد وہدایت کے شمع سے دنیا مستفیض ومنور ہو رہی ہے۔ موصوف کا خاص میدان تاریخ ہے جس کے وہ نقاد بھی ہیں اس موضوع پر متعدد کتاب بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں پھر بایں ہمہ جملہ اوصاف وکمالات اردو زبان وادب کے اسرار ورموز سے بخوبی واقف ہیں تاریخ اور ادب کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ بہت گہرا ہے ادبی مورخ کو اپنی تحریروں میں قدم قدم پر تاریخ کی ورق گردانی کرنی ہوتی ہے۔ سنین وشہود کے تعین کے علاوہ انکی مطابقت کے لیے کاوش کرنی پڑتی ہے مختلف زبانوں میں اس طرح کے جدول موجود ہیں۔ جس سے یہ مشکل بہت حد تک دور ہو جاتی ہے اس بنا پر تاریخ اور ادب کے موضوع پر اردو میں قلم اٹھانے کا جو حق پروفیسر موصوف کا ہو سکتا ہے کسی اور کا نہیں علامہ اقبال نے کہا ہے کہ: ''اہل دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہل نظر'' لہٰذا اسی کم یاب اہل نظر کی فہرست میں پروفیسر سید ظہیر حسین جعفری کا نام شمار ہوتا ہے۔ حالانکہ اس موضوع پر چھوٹی بڑی متعدد کتابیں

اردو میں لکھی اور شائع کی جا چکی ہیں لیکن جو مرتبہ و مقام اس کتاب کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ یہ واقعی مصنف کا کمال ہے کہ آج جبکہ تحقیق و تدوین کے نوع بہ نوع سامانوں کی فراوانی ہے۔اور اظہار و بیان کے اسالیب میں بھی طرفہ نیرنگی و بوقلمونی نظر آتی ہے۔اس کتاب میں مصنف کی تاریخ دانی علمی لیاقت اور قلم کی ضوفشانی و تابانی کی اپنی ایک منفرد حیثیت سے نمایاں ہے۔

اس کتاب کا وصف امتیازی صرف اس کا حسن بیان اور بلیغ طرز ادا نہیں ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم خصوصیت یہ ہے کہ صوفیاہائے سلون کی جملہ خدمات کو جو اسی خانوادے سے تعلق رکھنے والے اہل علم و نظر، دانشوروں، مفکروں اور عالموں نے قلم بند کیئے ہیں نہایت محققانہ اور طویل مقدمے میں اصول جرح و تعویل کی روشنی میں ان سب ماخذ کا جائزہ لیکر صحت و سقم اور استناد و عدم استناد کے اعتبار سے ان میں سے ہر ایک کا مرتبہ و مقام متعین کیا ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے خانقاہ سلون اور اس کتاب کے بارے میں جو اقتباس قلم بندا کیے ہیں اس سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔شمالی ہندوستان میں چند ہی ایسی خانقا ہیں اور خانوادے ہونگے جو اپنی تاریخ مستند ماخذ کے حوالوں سے اول تا آخر پیش کر سکتے ہوں خانقاہ کریمیہ سلون رائے بریلی بر سر یر آرائے مستند ایک ایسا ہی خانوادہ ہے جو اس امر پر معنی فخر کر سکتا ہے کہ اس کی تاریخ مصدقہ تذکروں کے علاوہ شاہی فرامین خاندانی دستاویزات انگریزی افسروں کے سفر ناموں اور انکی کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں۔۔۔اور ان کا ماخذوں کا استعمال انگریزی کتابوں اور دیگر مطبوعات میں خوب ہوتا رہا ہے اور علمی دنیا ان چیزوں سے بخوبی واقف ہے۔

موصوف کی یہ کتاب ایک نادر و بیش قیمت تحقیقی دستاویز ہے۔ضرورت ہے کہ ہم صوفیاہائے خانقاہ کریمیہ سلون کے مذہبی روحانی اسلامی اخلاقی تبلیغی ،لسانی ،ادبی و شعری محاسن کی حقیقی قدر دانی کا ثبوت دیں اور اس جانب سے عرفان جمیل کا قرار واقعی حق ادا کریں۔ان باشرع صوفیا نے انتہائی عظیم الشان انسانی ،اخلاقی ،روحانی اور تہذیبی خدمات کے ساتھ ساتھ زبان و ادب کی بڑی خدمات انجام دیں ہیں۔

فرحتِ روح کا شاعر: اصغر گونڈوی

یوں تو اصغر گونڈوی 1884ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے لیکن والد چونکہ گونڈہ میں ملازمت کرتے تھے اس لیے اصغر صاحب والد کے ساتھ گونڈہ ہی میں بہت دنوں رہے اور یہیں ادب و شاعری سے شغف ہو، نتیجتاً اصغر سے اصغر گونڈوی بن گئے۔ اپنے دور کے رائج زبانوں میں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی کی اچھی صلاحیت کے مالک اصغر گونڈوی کو کتب بینی کا بے حد شوق تھا جس نے ان کے ذہنی VISON کو کافی بڑا کر دیا۔ شاعری کی شروعات میں عام روایت کے مطابق واجد بلگرامی سے باضابطہ شاعری کے اسرار و رموز سیکھے اور بعد میں امیر اللہ تسلیم سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ شروع سے ہی طبیعت تصوف کی طرف مائل تھی۔ اردو مرکز لاہور سے بذریعہ ملازمت وابستہ ہوئے۔ رسالہ ہندوستان کی ادارت بھی سنبھالی 1936ء میں الہ آباد میں انتقال ہوا۔ ''نشاط روح'' اور ''سرود زندگی'' میں ان کی شاعری کا سرمایہ جمع ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ اردو شاعری میں اصغر گونڈوی کا اپنا رنگ متعین ہے۔ وہ اپنے مخصوص لب و لہجے کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ فانی کی طرح اصغر کی شاعری میں بھی یاس و حرماں نصیبی کا رنگ دور سے جھلکتا ہے لیکن کلام بوجھل اور خشک نہیں ہے۔

آلام روز گار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

☆

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

اصغر کے کلام میں جہاں مضامین کی بلندی ہے وہیں وہ شاعری میں رعنائی بیان کا خاص خیال

رکھتے ہیں حالانکہ ان کے کلام پر یاس کی بدلی چھائی ہوئی ہے لیکن اس کی وجہ صرف اور صرف ان کا فلسفیانہ مزاج ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا کی رنگینی سے کسی حد تک دامن بچا بچا کر چلتے نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین:

''اسلوب بیان کے لحاظ سے اصغر سبھوں سے الگ ہیں اور
اس میں شک نہیں کہ جہاں تک زبان کا تعلق ہے اتنا غیر
تقلیدی اور نرالے انداز تغزل کا نمونہ اردو میں کمیاب ہے''۔

یا پھر راجندر ناتھ شیدا جو اردو کی جدید تنقید میں ایک تسلیم شدہ حیثیت رکھتے ہیں ''اصغر کی شاعری'' کے زیر عنوان فرماتے ہیں۔

''اصغر کی نظر صحیح معنوں میں فنکار کی نظر تھی جو اپنے ماحول
کی ہر شئے میں حسن کا معائنہ کرتی تھی انہیں شاید تصوف
میں اس لیے بھی دلچسپی تھی کہ انہوں نے وحدۃ الوجود کا
فلسفہ پیش کر کے ساری کائنات کو حسن تعلق کا بوقلموں گلدستہ
قرار دیا اور گوناں گوں مظاہر کو سماوی تجلیات کے دلفریب
رنگوں میں ڈبونے کی کوشش کی''۔

اصغر کو کائنات اور اس کی ہر حسین شئے سے عشق تھا وہ ہر جلوۂ حسن کو اپنے مضطرب سینے سے زیادہ قریب کھینچنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ چیزیں ان کے لیے غیر محدود لذت کا سر چشمہ تھیں۔ ان کا قلم حسن کی کیفیات بیان کر کے رنگینیوں اور مسرت کا ساغر چھلکاتا تھا۔ کیسی دلکش تشبیہہ ہے۔

اس عارض رنگیں پر عالم یہ نگاہوں کا
محسوس یہ ہوتا ہے پھولوں میں صبا آئی

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایک دھڑکتا ہوا دل ضرور محسوس ہوتا ہے لیکن روتی ہوئی آنکھیں کہیں نظر نہیں آتیں اسی لیے وہ خود بھی کہتے ہیں۔

شعر میں رنگینیٔ جوش تخیل چاہیئے
مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

یا

فروش آرزو ہو نغمہ خاموش الفت بن
یہ کیا ایک شیوۂ فرسودۂ آہ و فغاں برسوں

اصغر رمز جمالیات سے بخوبی واقف تھے وہ نظارہ جمال کو ایک داخلی تجربہ تصور کرتے تھے۔

جلوہ تیرا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تمہیں اپنی نظر سے

ان کی نظر میں حسن وعشق ایک ہی شئے کے دو مختلف پہلو ہیں وہ حسن کے ناز اور عشق کے نیاز کے قائل نہیں بلکہ حسن وعشق کی باہمی کشش پر بہت زور دیتے ہیں اور عشق میں بھی حسن کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

محو ہے ذوق دید بھی جلوۂ حسن یار میں
ایک شعاع نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

☆

دید کیا نظارہ کیا اس کی تجلی گاہ میں
وہ بھی موج حسن تھی جس کو نظر سمجھا تھا میں

☆

کتنی پیاری شکل ان پردوں میں ہے جلوہ فروز
عشق کوتر و لیدہ مو آشفتہ سر سمجھا تھا میں

☆

کار فرما ہے فقط حسن کا نیرنگ کمال

چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

☆

عشق تھا آپ مشتعل حسن تھا خودنمود پر

میری نظر سے کیا ہوا تیری نظر نے کیا کیا

''شاہد تصوف'' سے اصغر کی دلچسپی کی وجہ جس کی طرف راجندر ناتھ شیدا نے اپنے خاص فکری تجربات کے ساتھ غور کیا ہے ہمیں ان کی شاعری میں ہی نہیں ان کی عام زندگی میں بھی نظر آتی ہے وہ پختہ مذہبی عقائد کے حامی تھے اور قاضی شاہ عبدالغنی سے انہیں شرف بیعت حاصل تھا۔

اصغر گونڈوی کی شاعری میں جمالیات کا ایک مستقل نظریہ ملتا ہے اور ان کے پورے کلام میں جونشاط و سرمستی ہے وہ وجدانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ ان کی بڑی خصوصیت خیالات کی یکسانیت یک رنگی و ہمواری ہے جو اردو کے دوسرے غزل گو شعرا کے یہاں موجود نہیں۔

راجندر ناتھ شیدا کے خیال میں:

ہمہ گیر جمال کے داخلی تصور نے اصغر کی شاعری میں ایک قسم کی انا پیدا کر دی تھی جس نے ان کی شاعری کو روایتی عشق کی دو بدعتوں سے محفوظ رکھا۔ ایک تو یہ کہ وہ کبھی محبوب کے در پر ''سر زیر بارِ منت درباں کئے ہوئے'' پڑے نظر نہیں آتے عظمت عشق کا احساس قدم قدم پر ان کی شاعری کے دھندلکوں سے جھانکتا نظر آتا ہے۔

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں

سو حسن کروں پیدا اک ایک تمنا سے

اسرار کی بارش ہو انوار کی ریزش ہو

ساغر کو جو ٹکرادوں اس گنبد مینا سے

یا پھر ان کا وہ مشہور شعر۔

نیاز عشق کو سمجھا کیا اے واعظ ناداں

ہزاروں بن گئے کعبے جبیں میں نے جہاں رکھدی

دوسرے ان کے یہاں رشک رقیب کی خلش اور ناکامئی محبت کی نوحہ خوانی ناپید ہے۔ اصغر کے عشق کی نوعیت پر غور کرنے سے ان کے جذبات کا تجزیہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے ان کی دلکشی کے مراکز غیر محدود ہیں جس میں کسی دوسرے کی شرکت ان کے اپنے جذبات پر کوئی اثر نہیں ڈال سکی ایسی صورت میں احساس رقابت اور رشک وحسد کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ عشق کو تقاضائے فطرت اور عین حیات تصور کرتے ہیں جس سے فرار ممکن نہیں۔ اصغر کے عشق کے سامنے مشکل سے حاصل ہونے والے مقاصد نہیں ہیں بلکہ وہ عشق کے ہر تجربے سے لطف اندوز ہونے کو ہی عشق کا مقصد خیال کرتے ہیں۔

حسن کو وسعتیں جودیں عشق کو حوصلہ دیا
جو نہ ملے نہ مٹ سکے وہ مجھے مدعا دیا

☆

کچھ اور عشق کا حاصل نہ عشق کا مقصود
جزایں کہ لطف خلش ہائے نالۂ بے سود

لیکن اسی عنوان پر ڈاکٹر اعجاز حسین کا خیال ہے کہ

''اصغر کی غزلوں میں عاشق ومعشوق کے باہم اختلاف اور ٹھیٹ انسانی جذبات تو بہت کم ملتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ موجودہ غزل گوئی میں اس چیز کا قریب قریب فقدان ہے''

اصغر کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پیش پا افتادہ مضامین سے علی العلوم گریز کیا ہے اور اپنے خاص طرز بیان سے کلام میں لوچ اور ندرت پیدا کی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اعجاز حسین خاص طور پر ان کے کلام کی اس خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصغر تشبیہ و استعارے میں خاص کاوش کرتے ہیں۔
عامیانہ وفرسودہ چیزوں سے گریز کر کے نہایت غور وخوض
کے بعد ایسی لطیف و نادر چیزیں پیدا کرتے ہیں کہ بعض
لحاظ سے ایسا ذخیرہ ادب میں ایک اضافہ سمجھا جاسکتا ہے''

راجندر ناتھ شیدا نے بھی ان کی اس خصوصیت کا خاص طور پر تذکرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''ان خصائص سے اردو شاعری میں اصغر کی جو انفرادیت
قائم ہوتی ہے اس کے علاوہ بھی ان کے یہاں ایک ایسی
صفت موجود ہے جس کے بغیر کوئی شاعری صحیح معنوں میں
بلند مرتبہ حاصل نہیں کر سکتی۔ اور وہ صفت ہے جدت اور
مشرقی شاعری میں وحدۃ الوجود حالانکہ یہ ایک پامال
مضمون ہے لیکن اصغر کے یہاں وہ کس کس پیرائے میں
جلوہ گر ہوتا ہے''

ہے ایک ہی جلوہ جو ادھر بھی ہے اُدھر بھی
آئینہ بھی حیران ہے اور آئینہ گر بھی

☆

بس اتنے پر ہوا ہنگامہ دارورسن برپا
کہ لئے آئینہ کیوں آغوش میں مہر درخشاں کو

☆

جو نقش ہے ہستی کا فانی نظر آتا ہے
پردہ پہ مصور ہی تنہا نظر آتا ہے
لو شمع حقیقت کی اپنی ہی جگہ پر ہے

فانوس کی گردش سے کیا کیا نظر آتا ہے

☆

سوبار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا

جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گر یباں تھا

☆

اس طرح چند لطیف کنائے بھی قابل داد ہیں۔

جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے ہمدم

چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

☆

جان بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی

اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

اصغر کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جو انہیں میں دوسرے غزل گوشعرا سے الگ کرتی ہے۔ بقول اعجاز حسین ان کے وہ اشعار خاص طور پر دلکش ہوتے ہیں جن میں غیر رخا اشیا یا کیفیات مجردہ کوروح فرض کرلیا جاتا ہے۔

بہرحال اصغر کے دونوں شائع شدہ مجموعہ ''نشاط روح'' اور ''سرود زندگی'' بہت مختصر ہونے کے باوجود بلند ترین شاعری کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

ناصر ملک کے شعری امتیازات

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے باتیں کر کے یا پھر جن کا ذکر خیر سن کر روحانی مسرت اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ایسی شخصیت اہل تصوف کے یہاں پیر و مرشد کی ہوسکتی ہے۔اہل اسلام بالخصوص اہل علم کے نزدیک عالم باعمل کی ہوسکتی ہے۔یا پھر کوئی بھی شخص جسے اپنا آئیڈل تصور کر لیتا ہے۔اسے قلب ونظر میں یہ مرتبہ عطا کر دیتا ہے۔لیکن ایسی شخصیتیں بہت کم ہوتی ہیں جو مذکورہ بالا میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی دلوں پر حکمرانی کرتی ہیں جن سے کمپیوٹر کے ذریعہ آن لائن اور فون پر گفتگو کر کے مسرت اور محبت کا احساس ہوتا ہے۔جن کی تصویر دیکھ کر احترام وعقیدت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور جن کا ذکر خیر باعث اطمینان قلب ہوتا ہے۔دراصل ایسے اشخاص انتہائی بلند کردار اور اعلیٰ درجہ کے انسانی بالخصوص،اسلامی اخلاقیات کے حامل ہوتے ہیں۔حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی کو پورے شعور کے ساتھ نہ صرف فریضہ تصور کرتے ہیں بلکہ ہر وقت اسے عملی طور پر انجام دینے میں پس وپیش سے کام نہیں لیتے۔ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ سے بے نیاز ہو کر ادبی اور انسانی خدمت کرتے ہیں۔میری نظر میں ایسی شخصیات میں سے ایک ناصر ملک بھی ہیں جو اپنے مرتبہ ومقام علمی حیثیت جذبۂ انسانی خدمت منسکر المزاجی،مہمان نوازی، ایثار وقربانی اور اردو واہل اردو سے بے لوث محبت کی وجہ سے وہ بڑی قد آور شخصیت کے مالک ہیں۔جسے عام قد وقامت والوں کے درمیان ناصر ملک صاحب کی شعری اور نثری تخلیقات میں سے کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو آن لائن بھی ان کے ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔مجھے اعتراف ہے کہ موصوف کی جملہ کتابوں کے مطالعہ کا موقع فراہم ہوا ہے۔میں نے ان کے آن لائن میگزین اردو سخن کے دیباچے اور دیگر ادبی تقریبات میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے علمی

موضوعات پر پیش کی گئی تقاریر کو پڑھنے کا موقع ملا ہے۔کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مستند علمی شخصیت اور معتبر ادیب ہیں۔ان کا مشاہدہ اور مطالعہ بہت وسیع ہے۔ناصر ملک صاحب کی شخصیت ہر اعتبار سے قابل تقلید ہے۔اہل پاکستان بالخصوص اردو کے لیے موصوف کی اس ارض بہشت یعنی آبائی وطن میں موجودگی کو نعمت غیر مترقبہ ہے۔

ہتھیلی جو کہ ناصر ملک کا شعری مجموعہ ہے اس میں حمد و نعت ،غزلیں، نظمیں اور آزاد نظمیں شامل ہیں ۔ناصر ملک نے اس مجموعہ میں تمام شعری وفنی تقاضوں کو برتتے ہوئے مختلف موضوعات مثلاً انسانی جذبات واحساسات کی ترجمانی اور قومی ملی کے مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔بعض نظموں میں زندگی کے تلخ تجربات کو بیان کیا ہے۔ یا اس شعری مجموعہ کے ذریعہ بالخصوص مجموعے کے آخر میں پنجاب وسندھ میں 2010 میں آئے سیلاب میں ہونے والی تباہی و بربادی سے متعلق تخلیقات پیش کی ہیں ۔ناصر ملک کا شعری سفر اس مجموعہ میں پختہ اور حساس نظر آتا ہے۔ان کا انداز ہ پیش کش ،موضوعات اور مسائل زندگی کے مطالعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

مہندی سے اِک خواہش اپنے ہاتھوں پر
سکھیاں لکھ کر چوری چوری پڑھتی ہیں

زندگی میں امید اور ناامیدی کی کیفیت ان کی شاعری کا حصہ ہے۔وہ زندگی سے مثبت نتائج اخذ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔لیکن ان کی نظر موجودہ دور کے نظام حیات پر گہری ہے۔ان کی امیدیں جہاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں وہیں وہ پر امید بھی نظر آتے ہیں۔

چراغِ شب جلا کہیں ؟ نہیں ،نہیں ، ابھی نہیں
سحر نے ڈھونڈ لی زمیں ؟ نہیں ،نہیں ، ابھی نہیں

ان کی شاعری میں کلاسیکی موضوعات کی رنگارنگی بھی خوب نظر آتی ہے۔مقتل ،جگنو،چشم جیسے الفاظ سے تغزل کا انداز پیدا کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔مثلاً

چشمِ تر میں نقوش لرزاں ہیں
غم یہاں بے لباس ہے میرا
جگنوؤں کو اُجال رکھا ہے
اس کا ملنا قیاس ہے میرا
ہیں بدن پر حقوق مقتل کے
دل مگر اُس کے پاس ہے میرا

جہاں ایک طرف قدیم روایتوں کے پاسداری ہے وہیں فرسودہ نظام سے بغاوت واحتجاج بھی موجود ہے۔عمل کے مقابلہ جتنے بھی بے عملی پر مبنی خیالات کا رواج ہے وہ اس پر ضرب لگاتے ہیں۔ہتھیلی کو استعارہ بنا کر زندگی کے مختلف جہات کی اشارہ کرتے ہیں۔شعر ملاحظہ ہو۔

لکیروں کو مٹا بھی دو، لکیریں مار دیتی ہیں
ہتھیلی کاٹ پھینکو ناں، ہتھیلی مار دیتی ہے
اے لڑکی! اِس ہتھیلی سے بغاوت ہو نہیں سکتی
اگر یہ رُوٹھ جائے تو محبت ہو نہیں سکتی
یہی تو لمس دیتی ہے شروعاتِ تعلق کو
سمندر ہے ، سمندر سے عداوت ہو نہیں سکتی
ہتھیلی کی لکیروں میں چھپے ہیں اوس کے موتی
مگر بے فیض ہاتھوں سے کرامت ہو نہیں سکتی
سنو! اپنی شرارت یا پہیلی مار دیتی ہے
ہتھیلی سے نہ اُلجھو یہ ہتھیلی مار دیتی ہے

زندگی کے تگ ودوہ میں انسان آج بھی۔۔۔۔کے زمانہ سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے۔ آج بھی اسے سخت محنت ومشقت کے عوض دو وقت کی خوراک میسر نہیں ہوتی۔کہنے کو زمانہ نے تو

بہت ترقی کرلی ہے اور زیست کو آسان سے آسان تر بنانے میں انسان نے نئے نئے آلات خلق کرلیے ہیں اور نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرلی ہیں ۔لیکن ایک عام شخص کیا ان وسائل سے فیضیاب ہو پاتا ہے جواب نفی میں ملے گا۔ناصر ملک اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ان کی نظر سماجی وسائل کی طرف گہری ہے۔مثلاً

یہ اور بات قافلے سرعت سے چل دیے
وہ شخص راہِ زیست میں اَب بھی کھڑا تو تھا
پلتا ہے غریبوں کی کمائی پہ جو بدبخت
رہزن ہے حقیقت میں وہ مخدوم نہیں ہے

جب بھی تشدد یا مذہبی منافرت نفرت کے عوض بے گناہوں کی جانیں جاتی ہیں اور برسہا برس انصاف کے لیے گجرات کے اندر ذکیہ جعفری جیسے دردر کی ٹھوکریں کھاتے ہیں تو ناصر ملک کا دل کرب سے تڑپ اٹھتا ہے۔

ساٹھ برسوں بعد بھی بوڑھی زبانوں پر ملے
حرص کے مارے ہوئے بلوائیوں کے تذکرے

جب بھی ظلم وجبر نے سر اٹھایا ہے تو ادیبوں اور قلم کاروں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے۔آواز بلند کرنے کے نتیجہ میں حکمراء طبقہ نے ادیبوں اور شاعروں کو زدوکوب بھی کیا۔فیض اور حبیب جالب جیسے شاعروں کو جیلوں میں ڈالا گیا اور کبھی جعفر زٹلی کی طرف شہید بھی کیا گیا۔لیکن ناصر ملک نے اپنا فرص نبھاتے ہوئے اس مسئلہ کی طرف اپنی شاعری میں اشارہ کیا ہے تاکہ ادیبوں،شاعروں اور صحافیوں کو حق گوئی کا حق حاصل ہوسکے۔

کبھی اِس جرم کی پاداش میں ایسا ہوا بھی ہے
کہ شاعر یا کہانی کار مقتل میں کھڑا ہو اور
اسے اتنی اجازت بھی نہ ہو کہ گفت گو کرلے

گھڑی بھر دیکھ لے اُس کو، جسے اس نے تراشا ہو
جسے ترتیب بخشی ہو، جسے برسوں تلاشا ہو
مجھے منظور ہو گا تم کوئی بھی فیصلہ لکھ دو
میں اپنے ہر ہنر میں بھی اُسے ترتیب دیتا تھا

وادیٔ سوات میں خواتین پر ہو رہے ظلم و جبر کے خلاف اپنی آواز یوں بلند کرتے ہیں۔

(وادی سوات کی ہجرت کے تناظر میں)

ہمارا حوصلہ انصار کا سا تھا مگر اس کو
ہمارے ناتواں دل سے اسی قصرِ امارت کے
لہو آلود جبڑوں نے اچانک نوچ ڈالا ہے
ہمیں معلوم ہے کل کو ہمارے گھر میں بھی ایسی
ہزاروں میّتوں پہ روٹیوں کے بین گونجیں گے

ناصر ملک کی شاعری میں ہجرت کے کرب کا احساس موجود ہے۔ آبائی وطن سے رخصت ہونے کے بعد سفر کی صعوبتیں اور نئی منزل کی تلاش و جستجو اور اجنبیت کے احساس کی تڑپ کو انہوں نے جذباتی انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

چار کمروں کی جنت کہانی ہوئی
میرے پُرکھوں کی محنت کہانی ہوئی
فصل اُجڑی، شجر، پھول، پودے گئے
ایک پل میں مویشی بھی اوجھل ہوئے
میری املاک کے سب نشاں مٹ گئے
سارے منظر اچانک بیگانے ہوئے
گھر کا رستہ بھی مجھ کو دکھائی نہ دے

کیا کروں آج کچھ بھی سجھائی نہ دے
میری بیٹھک نہ ڈیرہ ، نہ مسجد یہاں
دادی اماں نہ دادا کا مرقد یہاں
اب نہ بہنیں ، نہ بھابھی ، نہ بھائی یہاں
کیوں یہ قسمت مجھے لے کے آئی یہاں
میرا گھر ، میری دُنیا ٹھکانے لگی
زندگی کس طرف لے کے جانے لگی
نام درکار ہے اِس کڑے درد کو
زندگی چاہیے آخری فرد کو

ماں کی عظمت اور اس کی تقدس پر اشعار کہتے ہیں۔

چارہ گر ! بس مجھے سائباں چاہیے
چند لقمے نہیں لختِ جاں چاہیے
گھر کے سامان کا تذکرہ مت کرو
اور کچھ بھی نہیں، مجھ کو ماں چاہیے

ماں اس کائنات میں زندگی کا سرچشمہ ہے۔اس کا سایہ ہی کسی بھی شخص کی زندگی میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب میں اپنے وطن کو ماں کا درجہ دیا گیا ہے۔ناصر ملک زندگی دینے والے اور زندگی کی حفاظت اور پرورش کرنے والے دونوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی عظمت کے قائل ہیں۔کسی بھی آفت،مصیبت یا پریشانی میں انسانوں کی مدد کرنا ہی سب سے بڑی عبادت ہے۔پنجاب میں آنے والے سیلاب میں رضا کاروں کے لیے کہی گئی نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

وہ جو موت کی آنکھ میں آنکھ ڈالے
وہ پانی میں پھنسے ہوؤں کو نکالے

وہ معدوم ہوتی ہوئی چیخ سن کر
اجل کے شکنجے سے بیٹی چھڑا لے
کہیں مامتا کو تڑپتا نہ چھوڑے
کہیں باپ کی زندگی کو بچا لے
وہ ساگر میں پیاسوں کو پانی پلائے
وہ بھوکوں کو کھانا کھلا کر دعا لے
خبر دے وہ بیمار کو زندگی کی
وہ تن ڈھانپ کر آخرت بھی کما لے
وہ صدیق ثانی بنے ، گھر لٹا دے
وہ انصار بن کر مہاجر سنبھالے
وہ دریا سے ، پتھر سے ، آفت سے لڑ کر
کسی ایک ہی زندگی کو بچا لے

رضا کاروں کو جنھوں نے اپنے جانوں پر کھیل کر آفت آسمانی کی چنگل سے چھڑانے کے لیے خود اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالتے ہیں۔

بیٹے کے ہاتھ سے نیا بستہ پھسل گیا
بیٹی کا تھا جہیز جو دریا نگل گیا

سیلاب سے ہوئی بربادی وتباہی کا ذکر بہت ہی جذباتی انداز میں کیا ہے۔ یہاں ان کا رنگ کربلائی مرثیے سے جاملتاہے۔ وہیں کرب واندوہ جو کہ تاریخ اسلام کا حصہ ہے۔ ناصر ملک اس حادثہ میں محسوس کرتے ہیں جس میں سیلاب نے ہزاروں بے گناہوں کو نگل لیا تھا۔

ناصر ملک اپنی شاعری میں ایک پختہ کار شاعر کے حیثیت سے موجودہ دور کے صف اول کے شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کی شاعری کی مطالعہ سے بحسن وخوبی کیا

جا سکتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہو۔

یہ کس مقام پر ہمیں خدا نے لا کھڑا کیا
کوئی بتائے تو سہی کہ جرم ہم نے کیا کیا
یہ دھوپ کتنی تیز ہے ، کھلا ہے سر پہ آسماں
یہ بھوک بھی بلا رہی ہے ایک مرگِ ناگہاں
نگل گئی ہے پیاس میرے نونہال سینکڑوں
یہ آگ چاٹ کر چلی ہے باکمال سینکڑوں
جنہیں بچا رکھا تھا میلی آنکھ سے، وہ بیٹیاں
اَب عالمِ بے پردگی کی نذر ہوگئیں یہاں
یہ سیلِ بے ثمر ہمیں بھکاریوں کے روپ میں
کھڑا کیے ہے محوِ رقص دل شگاف دھوپ میں
سیاستِ وطن کا فیض ، بہہ گئے غریب گھر
وہ دشمنانِ قوم کی بچی رہی زمیں مگر
ہماری بے کسی کے اشتہار کس قدر بکے
مذاکروں کے نام پر کھلے ہیں اور مَے کدے
ہمارے نام پر برس رہی ہیں زر کی بارشیں
سجی ہوئی ہے منظروں سے ہر دکان دیکھ لیں
غریب کا معاوضہ حکومتوں کا مال ہے
فریب ہے ، یہ مقتدر کی بھوک کا سوال ہے
مرے خدا ! وطن کی سرزمین مجھ پہ تنگ ہے
مری طرف اُٹھی ہوئی نگاہ سرخ رنگ ہے

مذکورہ نظم میں خدا سے شکواہ کے انداز میں قومی بیضاعتی کا ذکر کرتے ہوئے فریاد کناں ہیں کہ خدا کی آفت سے کب نجات ملے گی۔ جب بھی کوئی آفت اور مصیبت آتی ہے تو غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ جبکہ حکمراں طبقہ کے لوگ اظہار افسوس کے بجائے اس لیے خوشیاں مناتے ہیں کہ امداد کی رقم کو کس طرح اپنی ذاتی تصرف میں لیا جائے۔ وہ اس کی ترکیبیں کرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان ہو یا پاکستان یا بنگلہ دیش ہر جگہ کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ شاعر وادیب کی ذمہ داری بھی سرحدوں کو نہیں دیکھتی۔ بلکہ جب بھی انسانیت کا خون ہوتا ہے ایک سچا اور حساس شاعر اس کرکو ذاتی کرب کی طرح محسوس کرتا ہے۔ ناصر ملک کا شمار انہیں شعراء میں کیا جا سکتا ہے۔

میرے مہمان ! بہتر پتا ہے تجھے
ہم ازل سے کڑی آفتوں میں رہے
خون، جنگ و جدل، زلزلے، آگ بھی
حکمرانوں کے ناوقت کے راگ بھی
آمریت نے توڑا ہمیں بارہا
عہدِ جمہور بھی خون پیتا رہا
ٹیکس کے عوض میں لوڈ شیڈنگ ملی
قحط و بحران کی آگ جلتی رہی
ملک دو لخت ہو کر سسکتا رہا
بینک بیلنس وزیروں کا بڑھتا رہا
اک سپاہی کا ڈنڈا ہی قانون ہے
سلطنت بھی وڈیروں کی مرہون ہے
لاکھ بھونچال ہوں ، لاکھ سیلاب ہوں
رہزنوں کے خزانے تو سیراب ہوں

میرے مہمان ! یوں دل نہ میلا کرو
چند لقمے مرے پاس ہیں ، بانٹ لو
میں نہ ممبر ، وڈیرا ، نہ سردار ہوں
ہاں مگر میں ہی تیرا الم خوار ہوں
ہم غریبوں میں گر یہ جہالت نہ ہو
ان لٹیروں کی ہم پر حکومت نہ ہو

سیلاب کے باوجود امراؤ کے خزانے بھرتے ہی جا رہے ہیں ۔ جہاں ایک طرف انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے وہیں دوسری طرف ذخیرہ اندوزی میں بڑے بڑے لوگ مصرورف ہیں ۔ اس پر شدید طنز کیا گیا ہے ۔ ناصر ملک کی شاعری کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں انسانیت سے ہمدردی اور ظلم سے نفرت و بغاوت ہے ۔ وہ اپنی بات بے باکی سے کہہ دیتے ہیں ۔ ان کی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب بھی سماجی وملی یا قومی مسائل کی طرف توجہ دلاتے ہیں ان کا شعری آہنگ کبھی متاثر نہیں ہوتا اور یہ ہنر ایک عظیم شاعر وفنکار کی عظمت کی دلیل ہے ۔ یہاں سے ان کی شاعری سے متعلق خصوصیات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے جبکہ وہ اپنی ہمہ جہت خصوصیات کی وجہ سے عالمی پیمانہ پر شہرت کے حامل ہیں ۔ چونکہ وہ ابھی بھی ایک فعال ادیب ودانشور کے حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ پوری اردو دنیا میں تمام برقی مجلّہ واخبارات سے متعلق صحافیوں کی اپنے برقی مجلّے کے ذریعہ رہنمائی فرما رہے ہیں ۔ موجودہ دور میں ایک مرد مومن کا یہی جہاد ہے ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی قارئین کو اپنی تحریروں افکار وخیالات سے سرفراز کرتے رہیں گے ۔

ہندوستانی تہذیب: ایک ساجھی وراثت

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کا یہ شعر جس میں وہ علی الاعلان کہتے ہیں:

سرزمین ہند پر اقوام عالم کے فراقؔ!
قافلے آتے گئے ہندوستاں بنتا گیا!!

صدیوں میں ہندوستان بننے کا عمل، قدیم وجدید تہذیب کے ہم آہنگ ہونے کا عمل اور ہند آریائی تہذیب کے شیر وشکر ہونے کی داستان بہت پرانی ہے۔ ہندوستان صدیوں سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں کے کھیت کھلیان، ندیاں، دریا، سمندر، ساحل، باغات، شہر، مکانات اور پہاڑ دنیا بھر کی اقوام کی خصوصی توجہ کے حامل رہے ہیں۔ یہاں کی صنعتوں اور حرفتوں نے، یہاں کی گنگا جمنی تہذیب اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی، یہاں کی آفاقی اور انسانی تعلیمات اور یہاں بسنے والی مختلف اقوام کے حیرت انگیز اتحاد نے دنیا بھر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے اور ان سے دادو تحسین اور خراج وصول کیا ہے۔ مگر وقت بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ اچھے حالات اور مواقع کا دشمن خود زمانہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی حادثے سرزمین ہند اور اس کشور ناز پر واقع ہوئے جنھوں نے اس کی تہذیب، اس کے تمدن، اس کی اقدار اور اس کی انسانی تاریخ کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تاہم ایسے وقت میں ہندوستان کے خمیر سے ہی ایسے افراد نے جنم لیا جنھوں نے وقت کی اس یلغار کو محسوس کیا اور بروقت ہوشیار ہو کر ہندوستان کی سرحدوں اور اندرون ہند کے تحفظ کا بیڑہ اٹھایا۔ کہیں وہ ان نامناسب حالات سے تلوار و تیر سے لڑے اور کہیں قلم و قرطاس سے ان کا مقابلہ کیا۔ انھوں نے میدان اور معرکے سر کیے اور رہتی دنیا تک اپنے نہ مٹنے

والے نقوش چھوڑے۔

اسی دوران ایسا بھی ہوا کہ اندرون ملک انسانیت دشمن گروہوں، اقوام اور افراد نے مشن ،منصوبہ بندی یا کسی انسانیت کش اسکیم کے تحت یہاں کی شیرازہ بندی کو منتشر کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت بھی ان قوم پرست افراد نے اپنی قوم اور ملک کی حفاظت کے اسباب مہیا کیے اور باہمی رواداری، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، بین المذاہب اتحاد و اتفاق کی بحالی اور اقداری کی برآوری کے لیے کوششیں کیں۔ نظمیں لکھیں، ترانے لکھے۔ مذہبی کتب کے ترجمے کیے، مسلکی روایات کو نئے اسلوب و آہنگ میں ڈھال کر پیش کیا۔ ان کی ان کوششوں، جدوجہد اور بے مثال قربانیوں نے ہندوستان کو بکھرنے اور ٹوٹنے سے بچایا اور دشمنوں کی چالوں کو ہر گام پر ناکام بنایا۔ ہندی کے معروف فکشن نگار بھیشم ساہنی اس سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ چھ سات سو برسوں میں عوامی سطح پر ہماری ایک ملی جلی تہذیب ابھری ہے۔ اس کی بنیاد ہمارے بھگتوں اور صوفیوں نے ڈالی ہے۔ انھوں نے ایک مشترکہ سوچ دی، ایک تہذیب دی۔ جو لوگ گاؤں دیہات میں صدیوں سے رہ رہے ہیں ان کی ساجھی زبان بن جاتی ہے۔ ہماری آج کی جو زبانیں ہیں وہ سب اسی کا حصہ ہیں۔ یہ ملک، یہ تہذیب ہم سب اسی کا حصہ ہیں۔ ہم ہر وقت مندر، مسجد میں تو بیٹھے نہیں رہ سکتے، ہم سماج میں ملتے جلتے ہیں، سارے کام مل جل کر کرتے ہیں۔ ایسا ساری دنیا میں ہوتا آیا ہے۔ آج تو ساری حدیں ٹوٹ رہی ہیں اور کچھ لوگ کہتے ہیں ٹوٹ جاؤ، بٹ جاؤ۔ یہ قطعی نہیں ہوسکتا۔''

ہندوستانی تہذیب کی وہ روایت جو تیرھویں صدی میں امیر خسرو کے ساتھ نمو پذیر

ہوئی، بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ہزاروں سال پہلے آریوں کے ہندوستان میں آمد کے بعد سے ہی جو تہذیب بن رہی تھی، وہی ہماری تہذیب کی بنیاد ہے۔ جسے بعد میں آنے والے لوگ ضرورتاً اس میں کچھ نئے تہذیبی خوبیوں کو شامل کرتے رہے۔ یہی وہ تہذیب ہے جس پر آج ہمیں فخر ہے۔ ہماری تعلیمی پالیسی جو برطانوی سامراج کے بنائے ہوئے تھے اس میں ہماری قدیم تہذیب کی نمائندگی پوری طرح سے نہیں ہورہی تھی، اب جو نئی تعلیمی پالیسی آئی ہے اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ جس ہزار سال کی تہذیب پر ہم فخر کرتے ہیں اس کو دوبارہ سے بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ ملک کی ترقی کے لیے سائنس وتکنالوجی کی تعلیم بہت اہم ہے لیکن اس کے ساتھ آپ سب کو بھی یہ قبول کرنا ہوگا کہ ہماری قدیم پرمپراؤں والی تعلیم جس میں سنسکرت اوراردو شامل تھی اس کا علم بھی بہت اہم ہے، تاکہ ہم اپنے اسی تہذیبی دائرے میں زندگی گزاریں جس روایت کو دیکھ کر دنیا ہندوستان اور یہاں کے لوگوں پر فخر کرتی ہے۔ اور دنیا میں ہماری پہچان الگ بنی رہتی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں اتنی ساری زبانیں بولنے والے ہوں، اتنے مذاہب کے ماننے والے ہوں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب ہندوستانی مشترکہ کلچر (composite culture) کو یاد کرنے کا کیا جواز اور کیا ضرورت آن پڑی؟ اس سوال کا جواب بس یہ دیا جاسکتا ہے کہ جہاں ہندوستانی باشندوں کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی، فسطائیت کا روپ لے چکی ہو، بازاروادکی تہذیب نے چکا چوند مچا رکھی ہو۔ برے بھلے اور غلط صحیح کی تمیز ختم ہو چکی ہو، خیالات اور وچاروں کی گنجائش کم ہوگئی ہو، اقدار اور اداب پیروں تلے کچلے جا رہے ہوں۔ جہاں مشترکہ جمال وحسن کے شاہکار تاج محل اور اجنتا، ایلورا بھی کار و بار کا حصہ بن چکے ہوں، وہاں مشترکہ کلچر (Composite culture) کو یاد کرنا اور بھی ضروری ہوجاتا ہے۔ صدیوں کی گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم و دیگر اقوام کی ملی جلی وراثت کو دہرایا جانا اور بھی لازمی ہوجاتا ہے۔ اگر کبیر ونظیر، نانک اور بھلے شاہ کی روایت کو فراق ونرالا، ٹیگور واقبال کی ملی جلی دھارا کو پھر سے بہا دیا جائے، ایکتا اور انیکتا کے نغمے

دوبارہ گائے جائیں تو یہ ہندوستان بھی بدلے گا اور ہندوستان میں رہنے والا ہر انسان بھی بدلے گا۔ ہندی بھی بدل جائے گی اور اردو زبان بھی بدل جائے گی، ہندو مسلمان بھی بدل جائیں گے۔ اس مشترکہ تہذیب کے ذریعہ ہم ہر مشکلات سے لڑ سکتے ہیں، مندر و مسجد کے سوال سے بھی، ہندو مسلم فساد سے بھی، علاقائیت سے بھی اور فرقہ واریت سے بھی اور تاریخ کی گھسی پٹی عصبیت سے بھی کہ ہمیں حال میں زندہ تو رہنا ہے، لیکن تاریخ کی عظیم روایت اور تہذیب کی انمول وراثت سے محروم رہ کر ہم محض بازار کے شوپیس ہو کر رہ جائیں گے، جسے کوئی بھی خرید سکتا ہے اور کوئی بھی فروخت کر سکتا ہے۔

کسی ملک کی تاریخ میں تہذیب سے ہی اس کی شناخت ہوتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ تہذیب کی بنیاد کیا تھی، کس حد تک اس میں قبول کی صلاحیت تھی اور کس حد تک دوسرے تہذیبی دھاروں سے خود کو ہم آہنگ کرنے کی سکت یا قوت تھی۔ ہندوستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے مختلف تہذیبی دھاروں سے اپنی شناخت یا پہچان بنائی ہے اور ہزاروں برس کی اقوام عالم کی تاریخ میں اگر آج ہندوستان زندہ ہے تو اس کا سبب اس کے مختلف علاقوں کے تہذیبی دھارے تھے جو ایک دوسرے سے اختلاف کے باوجود مشترکہ خوبیاں بھی رکھتے تھے۔ ان تمام تہذیبوں کے مختلف رنگ تھے مگر سب مل کر ایک رنگ تھا جسے گنگا جمنی کہا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے انسانی وجود میں ہاتھ کی انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں مگر سب ایک ہاتھ کا حصہ ہوتی ہیں۔

ہندوستان کی عظمت اور رنگارنگی کا اندازہ یہاں کی زبانوں سے ہوتا ہے۔ ہمارے آئین میں ملک کے سبھی طبقوں، مذہبوں اور سبھی لوگوں کی آرزوؤں اور امنگوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس سے ہم آہنگی کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ہندوستان کی اتحاد و اتفاق کو مضبوطی عطا کرنے والی ہے۔ اجنتا، ایلورا، تاج محل اور لال قلعہ ہماری ساجھی وراثت ہیں اور ہندوستان کے سبھی باشندے اس ساجھی وراثت کے امین ہیں، چاہے وہ کسی بھی زبان یا مذہب کے ماننے والے ہوں۔ عبادت کا طریقہ بدل جانے سے کوئی اپنی تہذیب سے کٹ نہیں جاتا۔ ہماری ساجھی وراثت کی مثال ایک ایسے

خوبصورت لباس سے دی جا سکتی ہے جو بھاشاؤں کے رنگ برنگے تانے بانے سے بہت ہی باریکی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ بھاشا روپی یہ مہین اور خوبصورت دھاگے اپنی الگ الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کی اپنی خوبیاں ہیں لیکن ان کی خوبصورتی، ان کی سماجی اہمیت اور ان کی تکمیل ایک دوسرے کے وجود پر منحصر ہے، اور ان سب کی مشترک پہچان نہ صرف ان کے اپنے وجود کو معنی دیتی ہے، بلکہ متحدہ ہندوستان کی عزت کو قائم رکھنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

میرے خیال میں برصغیر ہند و پاک مہاجروں کا ملک ہے کیونکہ یہاں کی آبادی کی اکثریت ایسی ہے جن کا آباواجداد باہر سے عظیم ہندوستان آئے تھے، جن کا رنگ، نسل، زبان اور روایات سب مختلف ہیں۔ ہندوستانی تہذیب کی بنیاد ایک دن میں نہیں بنی بلکہ صدیوں کی پرمپراؤں اور ریتی رواجوں سے مل کر ایک تہذیب نے جنم لیا۔ ملک میں حکومت کرنے والے حلمراں ہوں یا چھوٹے چھوٹے علاقوں کے راج واڑے ہوں ہر ایک نے ملک کو ایک دِشا دینے میں اہم کردار نبھایا ہے۔ میں یہاں الگ الگ کر کے ہر ایک بادشاہ کا نام نہیں لینا چاہونگا لیکن اکبر کا نام لینا مناسب سمجھونگا کیونکہ مسلمان بادشاہ ہونے کے باوجود انہوں نے اپنی حکومت خالص ہندوستانی تہذیب اور یہاں کی سماجی ضروریات کے حساب سے چلایا۔ اس کے لیے انہوں نے مشترکہ دین کو بھی چلانے کی کوشش کی تا کہ ہندوستانی عوام ایک دوسرے سے بیر نہ رکھے اور چین وسکون سے رہے۔

میں نے اپنے مضمون میں ماضی کے ان اردو دانشوروں، نظم نگاروں اور ادیبوں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے جن کی تحریروں سے ملک کو ایک دِشا ملی۔ جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ اردو شاعروں اور ادیبوں نے بھی تہذیبی، وطنی اور قومی ہم آہنگی کو بڑھاوا دینے کے لیے مسلسل کوششیں کی ہیں۔ میں یہاں ہندوستانی تناظر کی روشنی میں کہنا چاہوں گا کہ آج ہندوستان میں اردو اور سنسکرت سے ہماری نئی نسل ناواقف ہے۔ انگریزوں نے ہندو اور مسلمانوں کو الگ الگ کرنے کے لیے ایسی تعلیمی پالیسی اختیار کی کہ جس سے دونوں قومیں آپس میں کبھی مل جل کر نہ رہیں۔ اسی کے تحت ہندی کو ہندوؤں اور اردو کو مسلمانوں کی زبان دینے میں کامیاب ہوگیا۔ جبکہ

ہندی اور اردو دونوں دو بہنوں کی طرح ہیں۔ یا پھر یہ کہیں کہ انسان کی دو آنکھیں ہے جو ایک نظر سے سب کو برابر دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر تارا چندر لکھتے ہیں: ''مسلم ذہن ہندوانہ رنگ وروپ قبول کرنے لگا اور اس نے فارسی و ترکی کی جگہ مقامی زبانوں کو سیکھا اور استعمال کرنا شروع کیا۔ ہندوؤں نے عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کو مقامی محاوروں میں جگہ دی۔ اس لین دین کا منافع ہماری تہذیب کے خزانے میں اردو کی شکل میں شامل ہوا۔'' مگر افسوس کہ ہم اہل ہند اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر اتنے بہترین سرمایہ کو گنوار ہے ہیں۔ اردو محض ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب کا نام ہے۔ جس کی آبیاری میں مسلمانوں اور ہندوؤں نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اردو اتحاد و اتفاق کی علامت بھی، وطن دوستی کا عنوان بھی، وطن پرستی کا نشان بھی، مساوات، رواداری اور قومی یکجہتی کی ضمانت بھی، ملک سے سامراجی نظام کو ختم کرنے اور آزادی دلانے میں اردو کی نمایاں خدمات رہی ہیں۔ جس طرح مسلمانوں کا تہذیبی، ثقافتی، تمدنی اور مذہبی ورثہ اردو ادب میں موجود ہے، اسی طرح ہندو دھرم سے متعلق کثیر مذہبی سرمایہ بھی اردو ادب میں محفوظ ہے۔ مثلاً بھگوت گیتا، پران، رامائن، بدھ ازم، جین ازم وغیرہ سے متعلق معلومات یا تراجم۔ بھگوت گیتا کے تقریباً 82 مطبوعہ ایڈیشن اور پرانوں کے 45 نسخے اردو زبان میں دستیاب ہیں۔ ہر مذہب کے ماننے والوں نے اپنے دینی امور کی تبلیغ و ترسیل کے لیے اس زبان کا سہارا لیا ہے۔ اردو زبان و ادب کو آگے بڑھانے میں جتنا مسلموں نے مدد کی ہے اس سے کہیں زیادہ ہندوؤں نے اس زبان کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پریم چند سے کون واقف نہیں ہے۔ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو کون نہیں جانتا۔

کسی سے ملاقات کے وقت ہمارے پاس نمشکار، پرنام، شتشری کال اور السلام علیکم جیسے خوبصورت الفاظ ہیں لیکن اردو نے ہمیں آداب جیسے لفظ دیئے، جس میں ایسی خوبی ہے کہ اس سے پتا ہی نہیں چلتا ہے کہ سامنے والا کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے، اس کی پہچان یہاں صرف ہندوستانی ہوتی ہے۔

اردو کا ادب اور اس کی شاعری بھی اسی ہندوستانی تہذیب کا بیان ہے جو ہندوستان کو جوڑے رکھتی ہے اور وقتاً فوقتاً اس کی ٹوٹتی اور ڈوبتی نسوں میں روح پھونکی ہے۔ داستان ہو کہ ناول، افسانہ ہو کہ انشائیہ، طنز و مزاح ہو کہ سفر نامہ، مرثیہ ہو کہ قصیدہ، غزل ہو کہ نظم یہ تمام اصناف ہماری مشترکہ تہذیب کی آئینہ دار بھی ہیں اور اس زبان کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بھی۔ ان اصناف میں ہندوستان کی علمی و ادبی، سیاسی و سماجی، تہذیبی و تمدنی، معاشی و معاشرتی، اخلاقی و اقداری، اقتصادی و ثقافتی، مذہبی و ملّی، قومی و وطنی وغیرہ جیسے عناصر بکثرت پائے جاتے ہیں۔

اردو زبان کی اصنافِ سخن میں شاعری ایک اہم وسیلہ قرار پائی ہے جس نے مشترکہ تہذیب کی علامت کو اجاگر کرنے میں اہم اور قابلِ اعتنا کردار نبھایا ہے۔ جب کوئی گلوکار یا گلوکارہ اس کو گاتے ہیں تو کتنے ہی لب اس کی گنگناہٹ میں کھل جاتے ہیں۔ یہ بات کہنے میں اب کوئی تامل نہیں کہ شاعری میں بھی صنفِ نظم ہی نے سب سے زیادہ ہندو مسلم میں اتحاد، بھائی چارگی، باہمی اختلاط، اخوت، ہمدردی، یگانگت، مساویانہ حقوق، میل جول اور اپنائیت کے احساس کو نمایاں کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اردو صنف نظم میں ایسے شعرا کی بڑی تعداد موجود ہے جنھوں نے ان موضوعات کو اپنی شاعری کا اہم وسیلہ بنا کر عوام کے دلوں پر راج کیا۔ نظیر اکبرآبادی کی نظمیں پڑھیے، حالی، آزاد، اور سرسید کی نیچرل نظم و نثر کو پرکھیے جن میں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی حقیقت کی نایاب جھلکیاں نظر آئیں گی۔ ہندوستان میں حب الوطنی اور قومیت کا سیاسی تصور پیدا ہوا تو شعرائے کرام کے لب و لہجے میں خود بہ خود تبدیلی پیدا ہوئی۔ ابتدا میں اکبرالہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، افسر میرٹھی، برج نرائن چکبست، بعد ازاں ظفر علی خاں، درگا سہائے سرور، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، ساغر نظامی اور ایسے کتنے ہی نام ہیں جو فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ جن میں علامہ اقبال کے ''نظریہ وطنیت'' نے جس کی اساس وطن عزیز کی وابستگی پر تھی اپنا ''ترانہ ہند'' پیش کیا اور نونہالانِ وطن اور بلبلانِ چمن جھوم جھوم کر۔ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' گانے لگے۔ اور ان کی نظم ''نیا شوالہ'' اور اس کا وہ شعر:

شکتی بھی شانتی بھی بھکتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اسی طرح اسی نظم کا معروف مصرع:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

وہ آزادی سے پہلے کا دور ہو کہ اب کا وقت، حب الوطنی، قومی، مذہبی، تہذیبی، ملّی، تعمیری اور سماجی نظمیں / ترانے کہنے کا یہ رواج آزادی کے بعد بھی جاری و ساری رہا۔اس سلسلے میں 1960 کے بعد کے نظم نگار شعرا کی ایک طویل فہرست پیش کی جاسکتی ہے جنھوں نے اس نوعیت کے موضوعات کو شاعری میں برت کر اپنی شہرت کا ضامن بنایا۔ ضیا کرہانی، کمار پاشی، نازش پرتاپ گڑھی، نیاز حیدر، مظہر امام، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، بلراج کومل، چندر بھان خیال، عنبر بہرائچی، گوپال متل، علی جواد زیدی، سلام مچھلی شہری، معین احسن جذبی، جگن ناتھ آزاد، پریم وار برٹنی، انور جلالپوری، ریاضت علی شائق، مظفر حنفی، فرحت حسین خوشدل، سید احمد سحر وغیرہ وہ شعرا ہیں جنھوں نے ہندوستان کی قومی یکجہتی، حب الوطنی، مذہبی رواداری اور قومی میراث جیسے موضوعات پر نظمیں لکھ کر اردو شعر و ادب کی دنیا میں اپنی شناخت اور پہچان مضبوط کر لی۔

میری گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ آج ہمارے سامنے جو ہندوستان پنپ رہا ہے اس کی تہذیب، اس کے تمدن اور اس کے عوام کی آپسی رواداری اور فرقہ وارنہ ہم آہنگی کی تعمیر صدیوں سے جاری ہے جس میں یہاں کے صوفی، سنتوں، رشی منیوں، ادبا، شعرا اور اردو مفکرین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ حالاں کہ درمیان میں جب ہمارے ملک پر مغربی یلغار، مشنریز، تعلیمات، ان کے کلچر کے ذریعے پڑی جس نے ہندوستانی تہذیب کو نگلنا شروع کر دیا تھا اس وقت یہاں کی حساس اور فکر مند ہستیوں نے اس کا کھل کر مقابلہ کیا اور اس کی قلعی کھولنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتی۔

ان تمام کوششوں اور ان کی تخلیقات کو یاد کرنے یا دہرانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم پھر سے اپنے

اس کھوئے ہوئے ہندوستان کا سراغ لگا سکیں جو تیزی سے کہیں گم ہوتا جا رہا ہے ہمیں اس بات کی طرف بھی دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ کہیں اردو سے دوری کے سبب ہماری مشترکہ تہذیب کی ڈور ہاتھ سے چھوٹتی تو نہیں جا رہی ہے اور ہماری نئی نسلیں ان اقدار سے مسلسل غفلت برتتے ہوئے مغربی تہذیب کی پرستش اور پسندیدگی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہی ہیں۔ بلکہ ہر نئے آنے والے دن میں ان کی اپنی تہذیب سے دوریوں اور فاصلوں میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

فراق گورکھپوری کے شعر میں ہم تمام لوگوں کو بنانے اور سنوارنے میں ملک نے خوب محنت کی ہے۔ وہی قدیم تہذیب ہے جس کے سائے میں ہم لوگ پلے بڑھے ہیں، اب وقت ہے کہ ہم بھی وطن کو لوٹائیں تاکہ نئی نسل بھی قدیم مشترکہ تہذیب کے سائے میں اپنی زندگی کو سنواریں۔ شعر دیکھیں:

آغوش ملائم میں سلایا ہم کو
خاموش آواز سے جگایا ہم کو
کچھ ہم بھی بنائیں تیرے بگڑے ہوئے کام
اے خاک وطن تو نے بنایا ہم کو

میں اپنی بات مخمور سعیدی کے ایک نظم پر ختم کرنا چاہوں گا۔

صحرا بھی ترے گلشن گلشن سایے بھی ترے روشن روشن!
اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن!!
مندر کے کلس کیا ہیں ترے خوابوں کی سنہری تعبیریں!
مسجد کے مناروں میں تیری بیداری جاں کی تنویریں!!
اک تیری کتاب عظمت کی محفل سو تفسیریں!
چشتی کی دعا، نانک کی نوا، غالبؔ کی غزل، میراؔ کے بھجن!
اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن اے ارضِ وطن!!

جنگ آزادی اور اردو

ہندوستان جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا ہے 15 / اگست 1947 کو انگریزوں کی غلامی سے مکمل طور پر آزاد ہوا۔ لیکن یہ آزادی ایک دن کی جدوجہد سے نہیں ملی بلکہ اس کے لیے کئی برس لگ گئے کتنی ماؤں نے اپنے لال کھودیے۔ کتنے بچوں کے سر سے ان کا سایہ اٹھ گیا۔ کتنی عورتیں بیوا ہوگئیں۔ 1857 سے 1947 تک پورے 90 سال میں ملک آزادی کے لیے مختلف تحریکات کے ذریعہ انگریزوں کو ملک چھوڑنے پر مجبور کیا گیا، جس میں بشمول مسلمان، ہندو، سکھ اور عیسائی کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کے لوگوں نے بھی شانہ بہ شانہ حصہ لیا اور اپنی جانیں قربان کیں، مختلف تکالیف برداشت کیں اور قید کی سزاؤں کا سامنا کیا، پھانسی پر ہنسی خوشی چڑھ گئے، تب جا کر ہمیں مکمل آزادی نصیب ہوئی۔ 1857 کی پہلی جنگ آزادی بہادر شاہ ظفر کی قیادت میں لڑی گئی جس میں ناکامی ہوئی مگر اسی ناکامیابی نے کامیابی کے لیے مواقع فراہم کیے اور اسی جنگ نے ہر فرد کے اندر آزادی کا جوش و جذبہ منصوبہ اور ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کا نشانہ عطا کیا۔

جب بھی آتا ہے یوم آزادی آرزو دل میں کسمساتی ہے
جان جو کر گئے نثار وطن ان شہیدوں کی یاد آتی ہے

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی دو ہتھیاروں سے لڑی گئی۔ ایک گاندھی جی کا اہنسا اور دوسرا اردو زبان، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان تمام لڑائیوں کو اہمیت نہیں ہے جو میرٹھ کے سپاہیوں، دہلی کے باغیوں، سید احمد شہید، نانا صاحب، جھانسی کی رانی، شاہانِ اودھ، بھگت سنگھ، راج دیو، چندر شیکھر، رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ خان یا سبھاش چندر بوس نے لڑیں اور انگریزی اقتدار کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، جس پر قابو پانے کے لیے انگریزوں

نے ان گنت بے گناہوں اور عورتوں کو نہایت بے دردی سے پھانسی دے دی، توپ کے منہ میں باندھ کر اڑا دیا، گولیوں سے بھون دیا بلکہ اسے تو اور سو سال پیچھے سے شروع کرنے کی ضرورت ہے یعنی 1757 میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کی شکست اور شہادت سے جس پر اردو شاعری نے اپنا ردعمل ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

حقیقی معنوں میں ملک میں آزادی کی پہلی چنگاری تو 1757 میں ہی پھیلی تھی اور اس کا سارا Credit اردو زبان کو جاتا ہے، خاص طور پر اردو شاعری کو اس لیے کہ یہ اردو زبان ہی ہے جس نے انقلاب جیسا نعرہ دیا، یہ اردو شاعری ہی کا کمال تھا کہ دلوں میں آزادی کی تحریک نے جنم لیا، جوش پیدا ہوا۔ یہاں کچھ ایسے ہی اشعار پیش کرتا ہوں، جنھیں پڑھنے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سننے والوں پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔

لبالب پیالہ بھرا خون سے
فرنگی کو مارو بڑی دھوم سے

روز ہوتا ہوں نئے شخص کے گھر میں روپوش
آج پھانسی کی خبر ہے تو اسیری کی کل
خدا کرے کہ دین کے دشمن تباہ و برباد ہو جائیں
خدا کرے کہ فرنگی نیست و نابود ہو جائیں

دمدمے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی
اے ظفر ٹھنڈی ہوئی شمشیر ہندوستان کی

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی
تو لندن تک چلے گی تیغ ہندوستان کی

اردو زبان و ادب نے آزادی کے لیے ماحول کو سازگار کیا اور اردو زبان نے ہی آزادی کے متوالوں کے دلوں میں احساس اور جذبہ بیدار کیا اور اس مقصد کے لیے مشکل سے مشکل قربانیوں کا حوصلہ پیدا کیا ساتھ ہی ہندوستانیوں کے دلوں میں سرفروشی، جاں بازی اور حب الوطنی کے شعلوں کو اس طرح بھڑکایا کہ حصول آزادی تک ان کے جوش و جذبہ میں کبھی کمی نہ آئی۔

اردو جاننے اور پڑھنے والوں میں محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر کو توپ سے باندھ کر ہلاک کر دیا گیا، مشہور شاعر امام بخش صہبائی کو ان کے دو بیٹوں کے ساتھ گولی سے اڑا دیا گیا، مصطفیٰ خاں شیفتہ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا، مشہور و معروف عالم مولانا فضل حق کو جلا وطن کر کے انڈومان بھیج دیا گیا، جہاں ان کا بعد میں انتقال ہو گیا۔

تاریخ جنگ آزادی کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ادیبوں اور شعرائے کرام نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لیے ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ سو سال کی سیاسی غلامی نے ان میں آزادی کا جذبہ ابھارا، انھیں ایک قومی وحدت کا رشتہ سمجھایا، اپنے وطن سے ایک نئی محبت سکھائی، اپنے ماضی کو ایک نئے اور شاندار رنگ سے دیکھنا سکھایا اور اس کی یاد سے مدد لے کر ایک سنہرے مستقبل کا احساس دلایا۔ مگر ان کے مزاج نے عشق اور زندگی کا ایک نیا تصور دیا۔ اس کے اثر سے حالی کی مثنوی، حب وطن، اسمٰعیل کی ہندوستانی نظمیں، شوق قدوائی کی منظر نگاری، اکبر کی طنزیات، وحیدالدین سلیم کے پر جوش نغمے لکھے گئے۔ یہاں تک کہ اردو شاعری میں چکبست اور اقبال جیسے عاشق پیدا ہوئے۔ ایک نے وطن کی مشت خاک کے بدلے بہشت لینا بھی گوارا نہیں کیا، دوسرے نے خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھا۔ اگر ہم غور کریں تو پائیں گے کہ تحریک آزادی کے وقت ہندوستانیوں کو ایک دھاگے میں باندھنے کا کارنامہ جن زبانوں نے کیا ان میں اردو سرفہرست ہے۔ یہ وہی میٹھی اور دلکش زبان تھی جس کی

تحریروں،تقریروں اورشاعری نے ہندوستانیوں کے دلوں کو چھونے،آزادی کے حقیقی معنی سمجھانے اورانگریزوں کے مظالم سے مطلع کرانے کے ساتھ ان کی نئی نئی سازشوں کا پردہ فاش کرنے کا کام کیا اورآزادی کی راہیں ہموار کیں۔

اردو کے شاعراورادیب بحیثیت مجموعی ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں نہ صرف شریک بلکہ پیش پیش رہے تھے۔ ہماری سیاسی تحریک کی ہر منزل اور ہر مرحلے کی ادبی تصویریں موجود ہیں۔آزادی کا احساس دلانے والوں میں اقبال کا بڑا نام ہے۔جنہوں نے نہ صرف وطن کی عظمت کے گیت گائے بلکہ اپنے فکر وفلسفے کے ذریعے آزادی کی اہمیت کا بھی احساس دلایا۔ان کے علاوہ مخدوم محی الدین،فیض احمد فیض،علی سردار جعفری،ن م راشد، جاں نثار اختر،کیفی اعظمی وغیرہ وہ شعراہیں جنہوں نے تحریک کے زیراثر انقلابی شاعری کوظلم کے خلاف استعمال کیا۔

اس بات میں کوئی دورائے نہیں کہ اردو شاعروں اور مصنّفین نے اس تحریک کو تیز کرنے میں اپنا بھرپور تعاون دیا ہے۔'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ آپ زور سے لگا کر دیکھیے،آج بھی ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ ہماراخون جوش مارنے لگتا ہےاوراسے بھیڑ میں بولا جائے تو اس کا اثر مزید بڑھ جاتا ہے۔ یہ صرف ایک نعرہ نہیں ہے بلکہ ایک جذبہ بھی ہے جو ہمیں ماضی کی حقیقتوں سے بھی روشناس کراتا ہے۔ دولفظوں کا یہ نعرہ جس کو اردو نے جنم دیا، نہ جانے کتنے دلوں میں نیا جوش بھرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔اسی ایک نعرے کی پکار پر آزادی کے بے شمار متوالوں نے اپنے سروں کو قربان کر دیا اوراگر یہ کہا جائے کہ آزادی اس نعرے کی احسان مند ہے،تو کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نعرہ آزادی کا بگل اور منتر ثابت ہوا۔

1857 کے انقلاب نے انگریزوں کے خلاف جس حیرت انگیز ماحول کو پیدا کیا تھا اسے اردو شاعری نے انگریز دشمنی میں بدل دیا۔ غالب اور میر نے بھی غلام ہندوستان کا نقشہ اپنی اُردو شاعری میں پیش کیا اور کچھ ایسے اشعار کہے جس نے لوگوں پر گہرا اثر ڈالا۔ دلّی کی بدحالی اور پریشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے میر تقی میر نے لکھا:

دلی میں آج بھیک بھی نہیں ملتی انھیں
تھا کل تک دماغ جنھیں تخت وتاج کا

دلی جوایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے

جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

ہندوستان کے ہر شاعر کی شاعری میں آزادی کی جد و جہد کی گونج کو صاف سنا جا سکتا ہے۔ انھیں میں ایک اہم نام چکبست کا بھی شامل ہیں۔ پنڈت برج نرائن چکبست کا نام اردو شاعری کی تاریخ میں کافی اہم ہے۔ان کی شاعری میں حب وطن اور قومی یکجہتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی شاعری کا زندگی سے ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔ جہد آزادی میں ان کی شاعری وقت کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی تھی۔ چکبست کی نظموں کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر سیاسی واقعات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہیں۔ جوانوں کے جینے کے ڈھنگ پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

موجود ہے جن بازوؤں میں زور جوانی
طوفان سے انہیں کشتی قومی ہے بچانی
پر ہے مئے غفلت سے سروں میں یہ گرانی
آرام پسندی میں یہ رکھتے نہیں ثانی
پہلو میں کسی کے دل دیوانہ نہیں ہے
ہیں مرد مگر ہمت مردانہ نہیں ہے

اس طرح کے شعروں اور نعروں سے اردو شاعری بھری پڑی ہے، جس نے عوام کے دلوں میں جذبات کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا اور دیش کا بچہ بچہ آزادی کی جنگ میں کود پڑا تھا۔ 1857 میں آزادی کی پہلی چنگاری بہت جلد ایک شعلہ بن گئی اور اندر ہی اندر یہ آگ بڑھتی رہی جو 1947 میں جا کر بجھی۔ اس درمیان یعنی انگریزی دور حکومت میں اردو زبان کے اخبارات، اردو کی تقریروں اور شاعری نے ایک ایسی فضا تیار کی کہ ملک کی عوام اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار ہو گئی۔ بے شمار لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا، ہزاروں علماء، شاعر ادیب جیلوں میں ٹھونس دیے گئے یا قتل کر دیے گئے۔

اردو شاعری میں ہمیں سامراجی طاقتوں کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار ملتا ہے۔ غزل جو معاملات حسن و عشق اور واردات قلبی کی ترجمان سمجھی جاتی ہے اس میں بھی سلگتے ہوئے حالات کی آنچ محسوس ہوتی ہے۔ شاعرانہ رموز و علائم کے پردے میں غزل گو شعرا نے اپنے عہد کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے اور ان کے ظلم و ستم کا تذکرہ کر کے ہندوستانیوں کے دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

صبا سے ہر سحر مجھ کو لہو کی باس آتی ہے
چمن میں آہ گلچیں نے کس بلبل کا دل توڑا

(سودا)

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

(غالب)

ان کے بعد کے شعرا کے یہاں یہ ردعمل اور شدید ہو گیا ہے اور ان کے یہاں باغیانہ جذبات کی لے ایک للکار میں تبدیل ہو گئی ہے۔ چکبست، حالی، اکبر، حسرت، اقبال، ظفر علی خاں جوش وغیرہ کے یہاں جنگ آزادی کے پس منظر میں جذبات کی شعلہ فشانی عروج پر نظر آتی ہے:

طلب فضول ہے کانٹے کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے
(چکبست)
ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے
(حسرت موہانی)

اردو نظموں میں شعرانے اور بھی زیادہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے انہوں نے اپنے آتشیں نغموں سے باشندگان ملک کے دلوں میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے ظفر علی خان اور جوش کی شاعری نے جس طرح انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کو للکارا اس کی مثال شاید ہی کسی ہندستانی شاعری میں ملے۔

متاح لوح قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

جدوجہد آزادی میں اردو ادب نے آزادی کی تحریکات کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ایک طویل نظم ''حب وطن'' کے عنوان سے لکھی۔ ڈاکٹر سر علامہ اقبال نے اس وقت کے حالات کے پیش نظر ایک نظم ''ترانہ ہندوستان'' لکھی تھی۔ جسے اب قومی ترانے کے طور پر بھی وقتاً فوقتاً پڑھا اور گایا جاتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

علامہ اقبال نے اپنی نظموں کے ذریعہ آپسی اتحاد اور رواداری کو فروغ دیا ان کی نظموں ''صدائے اردو''، ''تصویر درد'' میں اہل وطن کو آگاہ کیا گیا ہے۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

علامہ اقبال نے ہندوستانی عوام میں آزادی کا جذبہ پیدا کیا ان کی شاعری نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری انسانیت کے لیے نہایت اہم سرمایہ ہے۔ بسمل عظیم آبادی ایک نوجوان نہایت حساس و جذباتی انسان تھے اور وہ ایک انقلابی شاعر تھے انہوں نے 1919 کے بعد ایک ایسی غزل تخلیق کی جس میں انگریزوں کے خلاف سرکٹانے کی بات کہی گئی۔ غزل کا یہ شعر دیکھیں:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

حالانکہ یہ شعر رام پرساد بسمل کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ شعر کس نے لکھا، ہے تو اردو ہی زبان میں۔ آپ اس منظر کا تصور کیجیے جب پھانسی کا پھندا گلے میں، سولی پر جھولنے کی تیاری اور رام پرساد بسمل، بھگت سنگھ اور راج گرو کی زبان پر یہ شعر تیر رہا تھا جس نے انگریزوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ آزادی کے ان سرپھروں کے روم روم میں آزاد ہندوستان کا جو خواب بس گیا ہے اس کو بندوق کی گولیوں اور پھانسی کے پھندوں سے روکا نہیں جا سکتا۔

اردو نظموں میں شاعروں نے اور بھی زیادہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ظفر علی خاں اور جوش کی شاعری نے جس طرح انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کو للکارا اس کی مثال شاید ہی کسی ہندوستانی زبان کی شاعری میں ملے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زندگی ان کی ہے دین ان کا ہے، دنیا ان کی ہے
جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہوگئیں

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی
واللہ کبھی خدمت انگریز نہ کرتے

نثری ادب نے بھی تحریک آزادی کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ افسانہ

نگاروں نے اپنے سیاسی ماحول سے متاثر ہوکر ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں اس دور کے سیاسی ہیجانات اور اثرات بے حد نمایاں ہیں، جذبہ حصول آزادی سے دلوں کو روشناس کرانا ان افسانوں کا موضوع اور مقصد نظر آتا ہے۔ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں پریم چند اور سلطان حیدر جوش کے یہاں کھوئی ہوئی آزادی کا ماتم اور غلامی کے خلاف جذبہ ہائے نفرت کا اظہار کثرت سے ملتا ہے۔ان کے افسانوں میں تحریک آزادی کے حوالے سے مختلف پہلوؤں کا ذکر ہوا ہے، بعد کے افسانہ نگاروں نے اور زیادہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے، ان افسانہ نگاروں میں سدرشن، علی عباس حسینی، کرشن چندر، منٹو، خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، بیدی، غلام عباس، سہیل عظیم آبادی اور انگارے کے افسانہ نگاروں کے نام سرفہرست ہیں، ان افسانہ نگاروں نے انگریزوں کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت اور ہندوستانیوں کی بے بسی کو کامیابی کے ساتھ اپنے افسانوں میں سمویا ہے اور تحریک آزادی کے مختلف مراحل کی تصویر پیش کی ہے۔

پریم چند، سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ ایسے نام ہیں جنھوں نے اردو میں اپنی لازوال تحریروں سے ملک کی آزادی کا پرچم بلند کیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ انگریزوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔منشی پریم چند کی افسانہ نگاری نے بھی اس سلسلے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ پریم چند نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں انگریزوں کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی اور ظالم و جابر حکومت کے خلاف آزادی کا نعرہ بلند کیا۔انہوں نے حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوکر ایک افسانہ ''سوز وطن'' قلم بند کیا۔ان کے پہلے افسانوی مجموعہ ''سوزِ وط'' (1905) کو انگریزوں نے ضبط کر کے اس پر پابندی لگا دی تھی۔کئی دوسرے مصنفین اور صحافیوں کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا تھا۔منٹو کی کہانیوں 'تماشہ'، 'نیا قانون' وغیرہ میں بھی انگریزوں کے تشدد اور عام آدمی کی تکلیف کو دکھایا گیا جس نے لوگوں میں بیداری پیدا کی۔ اردو زبان میں ہونے والے اس طرح کے کام سے انگریزوں کی پریشانیاں بڑھ رہی تھیں تو دوسری طرف آزادی کے متوالوں میں جوش بھر رہا تھا اور تحریک آزادی

زور پکڑ رہی تھی۔

پریم چند کے بعد اعظم کریوی، علی عباس حسینی، مجیب، بیدی، کرشن چندر، اختر اورینوی، اختر انصاری، احمد عباس وغیرہ نے اپنے افسانوں کے ذریعہ سے آزادی کے تصور کو پھیلایا ہے۔ ہندوستان کی آزادی کی جدو جہد کو مضبوط کیا ہے۔ آزادی کو سرمایہ داروں کی آزادی کے بجائے عوام کی آزادی بنانا چاہا ہے اور آزاد ہندوستان کے لیے اقتصادی، سماجی اور تہذیبی ضروریات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

تحریک آزادی سے متعلق بہت سے ناول بھی لکھے گئے جو اپنے عہد کی تمام سیاسی کشمکش کا آئینہ ہیں، ان ناولوں کے کردار اجنبی طاقتوں کے ظلم اور غیر ملکی حکومت سے نجات کے طلب گار نظر آتے ہیں، ان ناولوں میں ''گوشۂ عافیت''، ''چوگان ہستی''، ''لہو کے پھول''، ''آنگن''، ''نسلیں'' وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اردو ڈراموں میں بھی دوران جنگ آزادی ہندوستانیوں پر ہونے والے ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ جہاں بعض ڈراموں میں جذبہ بغاوت صدائے زیر لب تک محدود نظر آتا ہے، وہیں بعض ڈراموں کا بے باک اور باغیانہ لہجہ چونکا دینے والا ہے۔ ان ڈراموں میں ''یہ کس کا خون ہے'' اور ''نئی تصویریں'' (سردار جعفری)، ''آزادی'' (ابوسعید قریشی) اور ''نقش آخر'' (اشتیاق حسین قریشی) جیسے ڈرامے اس موضوع پر بہترین ڈرامے ہیں۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں اردو اخبارات نے بھی بہت ہی نمایاں رول انجام دیا ہے۔ آزادی کی جنگ میں صحافت کی دنیا میں سب سے پہلے شہید ہونے والا شخص بھی اردو زبان کا ہی ایک عظیم المرتبت صحافی مولوی محمد باقر تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ آزادی کا ایک روشن باب ہے اردو صحافیوں نے قومی یکجہتی، ملکی سلامتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے علاوہ اپنی بے باک تحریروں اور شعلہ انگیز شاعری سے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ اردو صحافیوں نے شمع

آزادی کی لو کو تیز کرنے اور ہندوستانیوں کے خون کو گرمانے کا جو اہم کارنامہ انجام دیا ہے وہ تاریخ آزادی وطن کا ایک روشن باب ہے۔ اس سلسلے میں ان صحافیوں کو قید بند کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کا باغیانہ لہجہ مدھم نہیں پڑا۔ مولوی محمد باقر کو شمالی ہند میں اردو صحافت کے بانی اور قائد کی حیثیت حاصل ہے انہوں نے دہلی اردو اخبار کے ذریعہ انگریزوں کو للکارا تھا۔ صادق الاخبار دہلی کا ایک اور بے باک اخبار تھا اس کے ایڈیٹر مولوی جمیل الدین تھے وہ بھی انگریزوں کے ظلم وستم کا شکار ہوئے۔ 1903 میں مولانا حسرت موہانی نے اردو معلیٰ شروع کیا جس کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف ولولہ انگیز مضامین شائع ہوئے جس سے انگریزی سرکار کے ایوانوں میں زلزلہ پیدا ہوا۔ جس کی وجہ سے انہیں جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور انہوں نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا۔ مولانا محمد علی کے ہمدرد، ظفر علی خاں کے زمیندار اور مولانا آزاد کے الہلال نے جنگ آزادی کی چنگاری کو بھڑکتے ہوئے شعلوں کی شکل دینے میں جو کوششیں کی ہیں، انہیں ہندوستان کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان اخبارات کے علاوہ ''پرتاپ''، ''اخبار عام''، ''پیسہ''، ''زمزم''، ''انقلاب'' اور ''جمہوریت'' وغیرہ اخبارات کی خدمات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ تحریک آزادی کے لیے ہندوستانی عوام میں جذبہ بیدار کیا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کی عوامی شعور کو بیدار کیا جذبہ وطن پرستی پیدا کیا۔ مسلمانوں کو بتلایا کہ ملک کی ترقی اور آزادی کی ذمہ داری تو ان کے سروں پر خدائے ذوالجلال کی طرف سے ہے دنیا میں صداقت کے لیے جہاد اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے وہ الہلال میں رقمطراز ہیں ''یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے لیے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ ہے''۔

ادب سماج کا نمائندہ ہوتا ہے۔ سماج میں رونما ہونے والے واقعات اور حادثات سے متاثر ہو کر ادیب اپنی تخلیق کرتا ہے۔ ایسی صورت میں آزادی کے جدوجہد میں جو صعوبتیں جھیلنی پڑ رہی تھیں اور عوام جس سے نبرد آزما ہو رہا تھا اس سے ادیب کیسے محفوظ ہو سکتا تھا۔ ادیبوں نے اسے اپنی

تخلیق کا حصہ بنایا اور تحریک آزادی کی بھرپور نمائندگی کی۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی پسند کے نام سے جو تحریک چلی تھی اس کے ذریعے لکھے گئے ادب میں آزادی کی پرزور طریقے سے حمایت کی گئی ہے۔ خاص طور سے اردو ادب میں شاعری ہو یا نثر میں افسانے یا ناول اور ڈرامے ان سب کے ذریعہ آزادی کے جذبے کو ابھارا گیا ہے۔ اسی طرح اس وقت کے اردو اخبارات میں برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کی چنگاریاں ابھاری گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے کتنے اخبارات پر پابندی عائد کی گئی اور کتنے صحافی سلاخوں میں ڈال دیے گئے یا پھر انہیں موت کی سزا دی گئی۔ بلاشبہ اردو ادب نے جنگ آزادی کی لو جلانے میں بیش بہا خدمات انجام دیے۔

کویت میں ادبی پیش رفت: ایک ادبی مکالمہ

اردو کی پیدائش اور نشونما ہندوستان کی مشترکہ تہذیب وثقافت کی دین ہے اس کے علاوہ اس کے اندر دوسری زبانوں کو قبول کرنے اور ان کی خصوصیات سے فائدہ اٹھانے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو نہ صرف برصغیر ہند و پاک میں بولی اور لکھی جاتی ہے بلکہ دنیا کے درجنوں ممالک میں نہ صرف بولی سمجھی جاتی ہے بلکہ اس زبان میں کثرت سے اخبار ورسائل شائع ہوتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے بعض خطوں میں ہندو پاک سے ہجرت کر کے جا بسنے والے مہاجرین کسی نہ کسی طور پر جہاں اپنی تہذیب اور مذہب سے وابستہ رہے وہیں اپنی زبان سے رشتہ قائم رکھنے اور اسے پروان چڑھانے میں کامیاب رہے۔ مگر جن نئی بستیوں میں ہند و پاک سے محنت مزدوری کرنے کی غرض سے افراد گئے ان میں موریشس، فیجی، سعودی عرب اور مشرق وسطی کے ممالک قابل ذکر ہیں جن میں کویت ایک اہم ملک ہے جہاں ہر سال لاکھوں افراد سیر وتفریح، ملازمت اور تجارت کی غرض سے سفر کرتے ہیں لہذا ایک اپنی رابطے کی زبان جسے اردو کہتے ہیں ان ممالک کی تہذیب ورہن سہن کا حصہ بن کر سامنے آتی ہے۔ اپنی جن خصوصیات کی وجہ سے اردو کی نشو ونما ہوئی تھی انھی وجوہات سے مشرق وسطی میں پروان چڑھی۔

جہاں تک ادبی سفر کا تعلق ہے تو ان ممالک میں رہنے والے مہاجرین نے اردو شعر وادب کی بے پناہ خدمات انجام دی ہے مشاعرے یہاں کی تہذیبی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ کویت میں تقریباً ستّر اسّی سال سے ادب وشعر کی روایت قائم ہے مگر اس پر کوئی مفصل معلوماتی کتاب موجود نہیں تھی، کسی مبسوط کتاب کی ضرورت بڑی شدت سے ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ اور اس

کام کے لیے ایک مرد کامل کی ضرورت تھی جو اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دے سکے۔ آج جس شخصیت کو تہنیت پیش کرنے کے لیے یہ جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔ برادرم افروز عالم صاحب نے اس کام پیڑا اٹھایا اور ان تمام تخلیقی کاوشوں کو جو اس خطّے میں قلمبند کی گئیں ان کے انتخاب کو یکجا کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کویت میں اردو تاریخ نویسی کا سنگ بنیاد برادرم موصوف نے ڈال دیا ہے۔ چونکہ خود وہ ایک ادیب وشاعر کا ذہن رکھتے ہیں اس لیے اس کام میں منصفانہ عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔

ڈاکٹر افروز کسی تعارف کے محتاج نہیں مگر پروفیسر مظفر حنفی کی زبانی ان کا تعارف کر دیا جائے جس سے ان کی علمیت، علم دوستی اور تحقیقی ذہن کا انکشاف ہو سکے۔ مظفر حنفی لکھتے ہیں:

''افروز عالم پینتیس چھتیس برس کی عمر میں ہی ادبی دنیا کے ایک جانے پہچانے قلمکار بن گئے ہیں اور اس مرتبے پر فائز ہیں جہاں پہنچنے میں عام لکھنے والوں کو اتنے ہی سال لگ جاتے ہیں جتنی ان کی عمر ہے''۔

جناب افروز عالم صاحب کی مرتب کردہ کتاب ''کویت میں ادبی پیش رفت'' ایک ایسی ببلی گرافی ہے جس میں ہر طرح کا مواد موجود ہے جن میں تعارفی مضامین میں مقالات وعلمی مباحث کی تحریریں ہیں۔ افسانے خاکے اور کالم کے علاوہ مزاحیہ مضامین کے علاوہ وفیات کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس میں ہر طرح کے پھول ہیں اور ہر پھول کی خوشبو جداگانہ ہے۔

اس مجموعہ کا دیباچہ اردو کے ایک ممتاز عالم اور ترکی کے ادیب وشاعر پروفیسر خلیل طوقار صاحب نے قلمبند کیا ہے۔ اس کتاب کی خوبی کا ذکر کرتے ہوئے اردو کی برصغیر کے باہر کے صورتحال پر اظہار خیال کرتے ہیں صاحب کتاب پر ان کا تبصرہ ملاحظہ ہو وہ رقمطراز ہیں۔

''افروز عالم صاحب کا شغل تو کمپیوٹر سائنس اور حساب کتاب سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان کا یہ شغل ان کے ادب اور فنون لطیفہ سے دلچسپی کے سامنے حائل نہیں ہوا ہے۔

اس لیے انہوں نے مختلف اصناف سخن کے میدانوں میں طبع
آزمائی کی ہے۔ غزل ہو، نعت ہو یا مضامین ہو انہوں نے
مختلف اصناف میں اپنا جوہر دکھاتے ہیں۔ افروز عالم
صاحب پرواز لندن ، بین الاقوامی جدا، سری نگر آمد۔
تحریک ادب، آجکل، مشاعر، اجرا، عالمی رنگ ادب، جیسے
اردو کے موقر جرائد کی کویت میں نمائندگی کرتے ہیں،
مختلف ادبی انجمنوں سے منسلک ہیں۔ اور مزید برآں
متعدد تصانیف بھی ان کے قلم سے نکل ہیں۔ ''کویت میں
ادبی پیش رفت'' کے عنوان سے شائع ہونے والی یہ تصنیف
بھی اسی ہم جہت ہستی کا ایک معلومات افزوں تحفہ ہے''۔

ڈاکٹر افروز عالم صاحب کتاب کے مرتب ضرور ہیں مگر اس کتاب میں خود ان کے بے شمار اور اتنے اچھے مضامین ہیں کہ وہ ایک کتاب کے متقاضی تھے۔ مثلاً ''ریاست کویت کا تعارف''، ''کویت سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل''، ''بیر بہوٹی: ڈاکٹر کلبہ قیصر کی شاعری'' اور شخصیت کی عکاسی، قد آور شخصیت اور شاعر ماجد دیو بندی، کویت کی ادبی انجمنیں، نثر نگار جو کویت سے چلے گئے، ہر دل عزیز نور پیکار، کویت کے شعراء وادباء کی تصانیف، کویت کی نثری تصانیف اور کویت کی شاعرات وغیرہ مضامین کی لمبی فہرست ہے جو کہ خود ان کے علمی کمالیت ان کا رنگ نظریات اور ادب دوستی کے ضامن ہیں۔ ان کے مضامین کے عناوین سے لگتا ہے کہ انہیں سرزمین کویت سے بے پناہ محبت ہے اور جو بھی کویت کا مہمان ہوتا ہے گویا وہ ڈاکٹر افروز عالم صاحب کا مہمان ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی بھی شاعر وادیب کی آمد سے فائدہ اٹھا کر ان کے اعزاز میں ادبی نشست کا انعقاد کیا جائے اور پھر روداد قلمبند کرنے تاریخ کے حوالے کیا جائے۔ اتنا علمی شغف بہت کم لوگوں میں دیکھنے کو ملتا۔

مشرف عالم ذوقی کی نظر میں افروز صاحب نئی بستیوں میں اردو کے معمار ہیں۔ ملاحظہ ہو:

''وہ ایک اچھے شاعر ہیں مگر نثر میں ان کی دلچسپی بھی شروع سے رہی ہے۔ شاعر تو ہر جگہ مل جاتے ہیں مگر نثر لکھنے والوں کو ایک جگہ جمع کرنا مشکل کام ہے۔ افروز صاحب نے عرق ریزی اور محنت سے یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ محض اسے ایک ادبی کارنامہ کہہ کر خوش نہ ہوا جائے، بلکہ اس کتاب کے مطالعہ، تبصرے اور تنقید کے ذریعہ یہ کوشش ہونی چاہیے کہ کویت میں مقیم حضرات کی حوصلہ افزائی ہو۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اردو کی بستیاں آہستہ آہستہ سرحدوں سے باہر نکل کر نئے راستوں کو بنانے کی کوشش کر رہی ہیں اور سب کا تعاون ملا تو ان بستیوں سے ایسے ایسے چراغ روشن ہوں گے کہ ایک دن اردو دنیا ان جیالے متوالوں پر فخر کر سکے گی''۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نثری خدمات کے بعد اب ڈاکٹر افروز عالم کی شعری خدمات کا جائزہ لیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہاں وہ اردو نثر اور علم و خدمت میں ایک بڑے مقام کے مالک ہیں، شاعری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی نظمیں اور غزلیں گہرے معانی کے سمندر میں ڈوبی ہو ئی اور عصری حاضر کے سلگتے اور دہکتے مسائل کا ترجمان ہیں۔ جن میں ہمارے عہد موجود کی وہ سچائیاں اور حقیقتیں ہیں جن سے ہم آئے دن دوچار ہوتے ہیں۔ بالخصوص فرقہ پرستی اور مغربی سامراج کی یلغار و مظالم اور زیادتیوں، اسی طرح فرقہ پرست حکومتوں و سماجوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'تجھے دیکھنے کے بعد'، 'آج اور کل'، 'ظلمات'، 'الزام'، 'محبت'، 'حالات'، 'شعور دل سے'، 'کیا یہ ممکن ہے (شبنم کے لیے)'، 'کسٹمر کا ٹائم ہے'، 'سمئے'، 'خیال'۔۔۔ افروز عالم کی نظموں

کے یہ چندعنوان برائے عنوان نہیں ہیں بلکہ ان میں گہری زندگی کے راز اور فلسفے مخفی ہیں۔وقت کی کجرو چال ڈھال پر قدغن لگانے کی کوشش ہے اور اپنے دل واحساس کو بھی تسلیاں دینے کی تلقین ہے۔گویا افروز عالم جنگ کے میدان میں ہیں جہاں دشمنوں نے ان کے ملک، ان کے وطن اور ان کی خاک کو تہس نہس کرنے کا ارادہ کر رکھا ہے، اس محاذ سے افروز صاحب، مرد وخواتین کو دعوت عام دے رہے ہیں کہ اگر وہ مرد ہیں تو میرے شانہ بشانہ ان ناگفتہ بہ حالات سے مقابلہ کریں اور اگر وہ خواتین ہیں تو اپنے آنچلوں کا پرچم بنا کر مجاہدین کا حوصلہ بڑھائیں، ان کے ارادوں کو مضبوط کریں اور ان کی رگوں میں جوش وامنگ بھر دیں۔۔۔افروز عالم کی ان نظموں کا لفظ لفظ اسی پیغام کا پیامبر ہے اور اسی احساس کا ترجمان بھی۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذیل میں چند نمونے درج کردیے جائیں:

کبھی کبھی

بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا

اپنے وجود سے کہیں دور

کسی کوہ سے الجھ جاتا ہے

یوں

بھٹک کر تنہائیوں کی

بانہوں میں

پناہ لیتا ہے!

کبھی کبھی

یوں بھی ہوتا ہے

میرے وجود کے نہاخانے میں

سرکتی ہوئی کوئی صدا

اپنی سرگوشیوں سے
دل کو اداس کر دیتی ہے
کہ
بے رنگ موسموں کی کڑواہٹ سے
الفاظ کے سحر میں
خواہشات کے ہجوم تلے
فریب کے بھنور میں
الجھ کر
وہ روٹھ جائے تو......کیا ہو؟
مان جائے تو.....کیا ہو؟

'حالات'

رفتہ رفتہ
معاف کرنے کا چلن
مدھم پڑتا جارہا ہے
کیا تمھیں یقیں نہیں؟
کہ
بدلتے ہوئے لمحوں کی چکی میں
اخلاقیات، روایات اور قدریں
پس رہی ہیں
آج ہمارا معاشرہ
بے غیرتی کے اس سنگم پر کھڑا ہے

جہاں
عورت کی پاکیزہ کوکھ
کرائے پر لینے کے لیے سودے بازی ہو رہی ہے
ہماری بے حسی نے
ہمارے لبوں پر خاموشی کی مہر ثبت کر رکھی ہے
تو اے اہل دل
کل
کیا ہوگا؟
جب معافی مانگنے کا چلن
ختم ہو جائے گا!

آج کل

اہل زر ہر مفلس کو
پاگل
کہا کرتے ہیں
دراصل
ہوس کا وہ آخری مرحلہ
ہم جسے
پاگل پن کہتے ہی
کسی مفلس پر
طاری نہیں ہوتا
یہ تو

الزام ہے
جو
مفلس کے ماتھے کی
شوبھا ہے
جو اپنی کوکھ سے
کئی گناہوں کو جنم دیتا ہے
نئے جہان کی تعمیر کرتا ہے!

'الزام'

مرے سامنے
کئی کوندھتی تلواریں ٹوٹیں
دیکھتے دیکھتے
کئی سورما شہید ہوئے
خرد و جنوں کی میں نے
کئی جنگیں دیکھیں
میں نے دیکھا
سوریہ پتر کو بے بس ہوتے
کئی شاہوں کے اوندھے پڑے پرچم دیکھے
یہ اور بات کہ
خاموشی میری فطرت ہے
میری آنکھیں لیکن کبھی بند نہیں ہوتیں
بڑے طریقے سے میں سب پر وار کرتا ہوں

مجھے پرکھنے کی ضرورت کیا ہے

کہ

میں تو سمئے ہوں.....!

'سمئے'

یہ ہیں افروز عالم کی نظموں کے چند نمونے جن میں حرف حرف سچائی اور لفظ لفظ صداقت بھری ہوئی ہے۔ جو ہماری زندگی کی وہ حقیقتیں اور سچائیاں ہیں جن سے ہمیں کسی صورت مفر نہیں بلکہ اگر ہم کچھ وقت کے لیے ان کی طرف سے آنکھیں بند بھی کر لیں تو وہ خود ہمیں اس غفلت سے ہوش کی دنیا میں لا کھڑا کر دیتی ہیں جہاں ہمارا حساب ہوتا ہے اور ہم اپنے کیے ہر فعل، انفعال اور کرتوتوں کا حساب دیتے ہیں۔

جہاں تک افروز عالم کی غزل نگاری یا غزل تخلیقیت کی بات ہے تو پتا نہیں کیوں انھیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں وہ رنگ اور وہ آہنگ نہیں ہے، نہ وہ گہرائی اور گیرائی بلکہ ان کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ابھی ان میں اور بھی بہت کچھ شامل کرنا باقی ہے۔ فن اور تکنیک سے قطع نظر، یہ غزلیں اردو ادب سے دل چسپی رکھنے والے حلقوں میں مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام ہیں تاہم چند ایک غزلیں، جنھیں افروز عالم کی نمائندہ غزلیں کہا جاسکتا ہے، ان کے منتخب اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

جذبات کی ہر بات سے ہم جوجھ رہے ہیں
بگڑے ہوئے حالات سے ہم جوجھ رہے ہیں
آوارہ ہواؤں کا پتا کون بتائے
سازش کی عنایات سے ہم جوجھ رہے ہیں
کچھ بہہ گئے سیلاب میں کچھ پاس بچے ہیں
بے وقت کی برسات سے ہم جوجھ رہے ہیں
ہیں اہل جگر چار سو محور میں اہل حسن

اور تاروں بھری رات سے ہم جوجھ رہے ہیں
حائل ہیں خواہشات میں زلفوں کے پیچ و خم
اک شوخ کی حرکات سے ہم جوجھ رہے ہیں
افکار کی آغوش میں ہر فن ہے حسیں تر
بے وجہ کمالات سے ہم جوجھ رہے ہیں

☆☆☆

ہولے ہولے سے جو چلتی ہے ہوا، رات گئے
کھچ کے رہ جاتی ہے یوں دل کی فضا، رات گئے
میری سانسوں میں ترے جسم کی خوشبو ہے بسی
دل میں جو شور مچاتی ہے صدا، رات گئے
تشنگی لب پہ سجائے ہوئے دل کہتا ہے
آج برسے گی مری چھت پہ گھٹا، رات گئے
ایک سایہ ہے میری زیست کا حاصل،جیسے
موم پگھلی تو بڑھی اور ضیا، رات گئے

☆☆☆

ADABI MUNAZARAT

Dr. Md. Yahya Saba

Published By:

MAAZ PUBLICATIONS

H.No.117, S. No.170, Zaitoon Pura,
Malegaon Nasik, Maharashtra, India, 423203

9 788193 047705